وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ (القرآن)

اور ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لیے آسان کر دیا ہے تو کوئی ہے کہ سوچے، سمجھے (سورۃ القمر)

جلد 11	شمارہ 10	محرم الحرام 1439ھ	اکتوبر 2017ء

ISSN 2305-6231

ماھنامہ

حکمتِ بالغہ

جھنگ

مدیر مسئول : **انجینئر مختار فاروقی**

مشاورت

ڈاکٹر محمد سعد صدیقی

حافظ مختار احمد گوندل

پروفیسر خلیل الرحمٰن

محمد فیاض عادل فاروقی

مدیر معاون ونگران طباعت: مفتی عطاء الرحمٰن

تزئین وگرافکس: جواد عمر

قانونی مشاورت:

محمد سلیم بٹ ایڈووکیٹ، چودھری خالد اختر ایڈووکیٹ

ترسیل زر بنام : انجمن خدام القرآن رجسٹرڈ جھنگ

اہل ثروت حضرات کے لیے تاحیات زرِ تعاون سترہ ہزار روپے یکمشت

سالانہ زرتعاون: اندورنِ ملک 400 روپے، قیمت فی شمارہ 40 روپے

قرآن اکیڈمی جھنگ

لالہ زار کالونی نمبر 2، ٹوبہ روڈ جھنگ صدر پاکستان پوسٹ کوڈ 35200

047-7630861-7630863

ای میل: hikmatbaalgha@yahoo.com

ویب سائٹ: www.hikmatbaalgha.com

www.hamditabligh.net

پبلشر: انجینئر مختار فاروقی طابع: محمد فیاض مطبع: سلطان باہو پریس، فوارہ چوک، جھنگ صدر

اَلْکَلِمَۃُ الْحِکْمَۃُ ضَآلَّۃُ الْمُؤْمِنِ فَحَیْثُ وَجَدَھَا فَھُوَ اَحَقُّ بِھَا (ترمذی)

حکمت کی بات بندۂ مومن کی گم شدہ متاع ہے جہاں کہیں بھی وہ اس کو پائے وہی اس کا زیادہ حق دار ہے

مشمولات

1	قرآن مجید کے ساتھ چند لمحات		3
2	بارگاہِ نبوی میں چند لمحات		4
3	حرفِ آرزو	انجینئر مختار فاروقی	6
4	پاکستان میں دہشت گردانہ سرگرمیوں کے اسباب کا جائزہ اور حل	پروفیسر عبدالخالق سہریانی	11
5	فکر اقبال کی روشنی میں نظامِ تعلیم کے خدوخال	ڈاکٹر محمد حسین	17
6	سیرتِ امام المرسلین ﷺ (14)	ساجد محمود مسلم	28
7	مسائل میراث اور ہمارے اُجڑتے خاندان (3)	حافظ مختار احمد گوندل	52
8	الیکشن اور دینی جماعتیں	محمد فہیم	51
9	روہنگیا کے مظلوم مسلمان.....	محمد منظور انور	56
	تبصرہ وتعارف کتب		61

ماہنامہ حکمت بالغہ میں قلمی تعاون کرنے والے حضرات کے مضامین معلومات کے تبادلے اور وسیع تر انداز میں خیر کے حصول اور شر سے اجتناب کے لیے چھاپے جاتے ہیں ادارے کا مضمون نگار حضرات سے تمام جزئیات میں اتفاق ضروری نہیں۔

یہ رسالہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو حوالہ ڈاک کر دیا جاتا ہے۔ نہ ملنے کی صورت میں 6 تاریخ تک دفتر رابطہ فرمائیں (ادارہ)

قرآن مجید

کے ساتھ

چند لمحات

سورۃ الماعون آیات 7، رکوع 1

اس سورۃ مبارکہ میں بتایا گیا ہے کہ انسان کے اندر پاکیزہ کردار ایمان بالآخرۃ سے ہی پیدا ہوسکتا ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ کیا تم نے غور نہیں کیا کہ جو شخص روزِ جزا کو جھٹلاتا ہے وہی تو ہے جو یتیم بچے کو دھکے دیتا ہے یا اس کا حق مارتا ہے اور مسکین ومحتاج کو کھانا کھلانے کی کسی دوسرے کو بھی ترغیب نہیں دیتا (حالانکہ بدیہی بات ہے کہ یتیم و مسکین لوگ ہمدردی کے زیادہ مستحق ہوتے ہیں) پھر ایسے جھٹلانے والوں کے مقدر میں تباہی (جہنم) ہی آئے گی جو (اوّلاً تو) نمازوں سے غافل رہتے ہیں کبھی نماز پڑھتے بھی ہیں تو محض لوگوں کو دکھانے کے لیے پڑھتے ہیں اور مال میں سے بھی کچھ خرچ نہیں کرتے۔

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ O

بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جو (روزِ) جزا کو جھٹلاتا ہے

فَذٰلِكَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ O

یہ وہی (بدبخت) ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے

وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ O

اور مسکین کو کھانا کھلانے کے لیے (لوگوں کو) ترغیب (بھی) نہیں دیتا

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ O

تو (ایسا شخص چاہے نماز کی پابندی بھی کرتا ہو تب بھی)

ایسے نمازیوں کی خرابی (جہنم) ہے

الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ O

(یہی لوگ ہیں) جو (اپنی) نماز کی طرف سے غافل رہتے ہیں

الَّذِيْنَ هُمْ يُرَاءُوْنَ O

(یہی لوگ ہیں) جو دکھاوے کی نماز پڑھتے ہیں

وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ O

اور برتنے کی چیزیں استعمال کے لیے مانگنے والوں کو نہیں دیتے

صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْم

Contentment is not the fulfillment of what you want, but the realization of how much you already have

قناعت

قناعت اپنی خواہشات کو پورا کرنے کا نام نہیں بلکہ وہ احساس ہے

کہ جتنا آپ کو نوازا جا چکا ہے آپ اس پر کتنا مطمئن ہیں

ہم زندگی میں ضرور کامیاب ہوں گے اگر

ہم اُن نصیحتوں پر عمل کر لیں جو دوسروں کو کرتے ہیں

بارگاہِ نبوی ﷺ میں چند لمحات

قَالَ النَّبِیُّ ﷺ

1

أُوْصِیْکُمْ بِأَصْحَابِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ ثُمَّ یَفْشُو الْکَذِبُ حَتّٰی یَحْلِفَ الرَّجُلُ وَلَایُسْتَحْلَفُ وَیَشْھَدَ الشَّاھِدُ وَلَایُسْتَشْھَدُ، أَلَا لَایَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرأۃٍ اِلَّا کَانَ ثَالِثَھُمَا الشَّیْطَانُ، عَلَیْکُمْ بِالْجَمَاعَۃِ وِاِیَّاکُمْ وَالْفُرْقَۃَ فَاِنَّ الشَّیْطَانَ مَعَ الْوَاحِدِ وھُوَ مِنَ الْاِثْنَیْنِ أَبْعَدُ، مَنْ أَرَادَ بُحْبُوْحَۃَ الْجَنَّۃِ فَلْیَلْزَمِ الْجَمَاعَۃَ، مَنْ سَرَّتْہُ حَسَنَتُہٗ وَسَائَتْہُ سَیِّئَتُہٗ فَذٰلِکُمُ الْمُؤْمِنُ

(ترمذی، عن عمر رضی اللہ عنہ)

''میں تمھیں وصیت کرتا ہے ہوں اپنے صحابہ کے بارے میں اوران لوگوں کے بارے میں جوان کے متصل بعد آئیں گے۔اس کے بعد جھوٹ عام ہوجائے گا،حتیٰ کہ آدمی قسم اٹھائے گا جبکہ اس سے قسم نہیں اٹھوائی جائے گی،اور آدمی گواہی دے گا جبکہ اس سے گواہی نہیں مانگی جائے گی۔خبردار رہو! کہ جہاں کہیں بھی کوئی مرد کسی غیرمحرم عورت کے ساتھ تنہائی میں ہوتا ہے وہاں تیسرا شیطان ہوتا ہے۔تم جماعت کولازم پکڑواور علیحدہ ہونے سے بچو کیونکہ شیطان اکیلے آدمی کے ساتھ ہوتا ہےاوروہ دوسے دوررہتا ہے۔جوآدمی جنت میں اعلیٰ مقام چاہتا ہے اسے چاہیے کہ وہ جماعت کولازم پکڑے۔جس شخص کواس کی نیکی خوش کرےاوراس کی بُرائی ناگوار لگےتووہ ایمان والا ہے۔''

الجامع الصغیر فی احادیث البشیر و النذیر، للامام جلال الدین السیوطی

حالیہ مغربی عسکری، سیاسی اور تہذیبی عروج اور ____ عالمِ اسلام

انجینئر مختار فاروقی

● آج دنیا میں ایک عالمی تہذیب ہے جو جاپان سے لے کر امریکہ کے مغربی ساحل تک اور قطب شمالی سے قطب جنوبی تک چھائی ہوئی ہے۔ کہنے کو تو سیاسی طور پر قریباً دو سو علیحدہ آزاد ممالک ہیں تاہم سطح زمین پر میدان، وادیاں، پہاڑ، جنگلات اور ریگستانوں کے باوجود 50 کلومیٹر بلندی پر ساری دنیا میں ایک ہی فضا ہے جو ملکوں کی سیاسی حدود و قیود سے بہت بلند اپنا سکہ جمائے ہوئے ہیں۔ اسی طرح نظریاتی اور تہذیبی سطح پر آج مغربی تہذیب اور مغربی نظریات کل روئے ارضی پر محیط ہیں۔ نچلے طبقات میں چاہے رنگ، نسل، علاقہ، زبان، مال و دولت، پیشہ، برادری، مذہب اور نظریہ کی بنیاد پر کوئی اونچ نیچ ہوتا ہم ہر معاشرے کے آسودہ حال طبقات اور مقتدر طبقات معمولی فرق کے ساتھ ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔

● ذرا غور فرمائیں دنیا کے ہر ملک میں V.O.A. اور B.B.C. کے پروگرام، خبریں اور تفریحی فلمیں چاہے کوئی انسان اپنی علاقائی زبان میں ہی سن رہا ہوتا ہم اُس کے ذریعے MESSAGE تو دنیا بھر میں ایک ہی جا رہا ہے۔

● ڈالر ____ عالمی کرنسی ہے۔ UNO کے ذریعے دنیا کی پانچ بڑی طاقتیں روئے ارضی کے تمام وسائل اور بناؤ و بگاڑ کے مالک ہیں۔ ان پانچ ممالک کو کس نے یہ مقام دلایا ہے اور یہ پانچ ممالک کیوں آپس میں ہم آہنگی کے ساتھ گزشتہ پون صدی سے تابعدار بچے کی طرح کسی

بڑی RESISTANCE کے بغیر ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے شانہ بشانہ رواں دواں ہیں۔ یہ اہل علم کے لیے کوئی راز نہیں۔

● سیکولرازم اور لبرل ازم ایک نعرہ ہے جس کے ذریعے ایک خاص طبقہ نے ملٹی نیشنلز کے نام پر دنیا بھر کے انسانوں کو ایک معاشی حیوان بنا کر صرف کمانے، کھانے اور آرام پر لگا دیا ہے۔ سر کے بالوں سے لے کر پاؤں تک سینکڑوں ملٹی نیشنلز ہیں جو کام کر رہی ہیں۔ انہی ملٹی نیشنلز نے میڈیا پر ADVERTISEMENT کے ذریعے لوگوں میں نئی پراڈکٹس کی خریداری کا ایک جنون پیدا کر رکھا ہے۔ ایک نظریاتی انسان کے لیے یہ زندگی ایک نظریاتی موت سے کم نہیں۔ بقول اقبال

؎ عصر حاضر ملک الموت ہے تیرا، جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکر معاش

اور ؎ دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا

اس عالمگیر تہذیبی برتری میں مغرب نے افکار و نظریات اور معلومات کی تیز رفتار ترسیل یعنی ای میل، SMS، موبائل فون، سٹیلائٹ اور وائرلیس فون، لیپ ٹاپ کمپیوٹرز اور سب سے بڑھ کر انٹرنیٹ کے ذریعے پوری دنیا (GLOBE) کو اپنی گرفت میں جکڑ رکھا ہے اور حقیقتاً ایک گاؤں (GLOBAL VILLAGE) بن گئی ہے۔

اس عالمگیریت کی فضا میں سیکولرازم اور لبرل ازم کے تعفّن نے اہل فکر و نظر اور باضمیر لوگوں کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ تہذیب مغرب کے علمبردار اور کارپردازان تو روزِ اوّل سے ہی سمجھتے ہیں اور بالارادہ گزشتہ چار پانچ صدیوں سے کائنات بمقابلہ اللہ، بدن بمقابلہ روح، دنیا بمقابلہ آخرت اور حیوانیت بمقابلہ نظریہ اور مقصدیت کے شعبہ جات میں حالت جنگ میں ہیں اور مغربی طاقتیں اور ان کے پس پردہ نہ نظر آنے والی قوتیں اس جنگ کو ایک مقدس نظریاتی جنگ ہی سمجھ کر سرگرم عمل ہیں صرف مخالف قوتوں کو دھوکہ دینے کے لئے اس کے لئے کئی خوبصورت لیبل اور عنوانات بنا دیے ہیں جس سے گذشتہ چند صدیوں میں انسان آہستہ

آہستہ مغربی تہذیب کے سامنے ہتھیار ڈال چکا ہے یا ڈالنے کے لئے تیار ہے۔

- ماضی قریب میں کوئی 20 سال قبل ایک امریکی مصنف سیموئل پی ہنٹنگٹن نے 'تہذیبوں کا تصادم'(CLASH OF CIVILISATION) کے نام سے کتاب لکھی جس میں مسلمانوں اور اسلام کو اپنا سب سے بڑا جاندار مخالف یعنی 'لوہے کا چنا' ثابت کیا ہے جس کو چبانا مغرب کے لئے آسان نہیں ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> ''.....1500ء سے 1750ء کے درمیانی عرصے میں پہلی عالمی سلطنت کو قائم کرنے میں مغرب والوں کی کامیابی کا دارومدار ان کی جنگی استعداد میں اضافے پر تھا جس کو ''فوجی انقلاب'' کا عنوان دیا گیا ہے۔ مغرب نے دنیا کو اپنے نظریات یا اقتدار یا مذہب میں برتری کی وجہ سے فتح نہیں کیا تھا بلکہ اس وجہ سے فتح کیا تھا کہ منظّم تشدد کرنے میں اس کو برتری حاصل تھی۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کو مغرب کے لوگ تو بھول جاتے ہیں لیکن غیر مغربی لوگ فراموش نہیں کرتے۔''

- یہ بات چاند وسورج کی طرح کی واضح ایک حقیقت ہے جسے گزشتہ کئی صدیوں سے بالعموم مغربی نظامِ تعلیم نہیں بتاتا اور بالخصوص لارڈ میکالے (جس نے جنوبی ایشیا میں صہیونی مغربی نظام تعلیم کی داغ بیل ڈالی) کے نظام تعلیم میں مسلمانوں کو خبر نہیں ہونے دی جاتی کہ اٹھارھویں صدی کے آغاز تک عظیم مسلم سلطنت عثمانیہ دنیا کی تاریخ میں روئے ارضی پر بننے والی سب سے بڑی سلطنت تھی جہاں امن بھی تھا، انسان دوستی بھی تھی، اخلاق دوستی بھی تھی، علم دوستی بھی تھی، احترامِ جان و مال بھی تھا اور غیر مسلم رعایا کو مسلمانوں سے بڑھ کر تحفظ حاصل تھا۔ یورپ میں صنعتی ترقی کے نتیجے میں بیداری کی لہر اٹھی تو یورپی اقوام اپنے صنعتی مال کی کھپت اور کارخانوں کے لیے خام مال کی تلاش کے لیے نکلیں تو انہیں اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کی راہ میں مہذب اور آباد دنیا میں سب سے بڑی رکاوٹ سلطنت عثمانیہ ہی نظر آئی۔ لہٰذا نادیدہ ہاتھوں نے جلد ہی بظاہر متصادم یورپی اقوام میں ایسا اتحاد و یگانگت کا ماحول پیدا کر دیا کہ سلطنت عثمانیہ کو راستے سے ہٹانا ہی سب سے بڑا مشن تھا۔

اس انسان دشمن، اخلاق دشمن اور علم دشمن منصوبے کے لیے روسی اقوام (سائبیرین)،

برطانوی اور مغربی یورپی اور وسطی وجنوبی یورپ کی اقوام نے اپنے گھر سے نکل کر جس مسلمان علاقے کو دیکھا اس پر قبضہ کرلیا۔ یہ قبضہ سلطنت عثمانیہ کے جسم سے ٹکڑے کاٹ کر کھانے کے مترادف تھا۔ ان یورپی اقوام نے مسلمانوں اور بالخصوص عثمانیوں اور ترکوں کے لیے (حالانکہ وہ چند صدیاں قبل کے سائبیرین ہی تھے) وہ غیر انسانی اور غیر اخلاقی رویے اپنائے، کتابیں لکھیں، مضامین لکھے، نصابِ تعلیم بنایا کہ خدا کی پناہ۔ روس آگے بڑھا۔ برطانیہ نے جنوبی ایشیا سمیت دنیا کے وسیع علاقے قبضہ میں کر لیے۔ امریکہ (شمالی وجنوبی) پر قبضہ جما لیا گیا۔ امریکی قدیم نیشنلز (ریڈانڈین) کو اس بے دردی سے مارا کہ انسانیت منہ دیکھتی رہ گئی۔ مشرقی یورپ ترکوں کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ افریقہ کا پورا براعظم پہلے ترکوں کے پاس تھا آہستہ آہستہ سارے علاقے پر یورپی اقوام نے قبضہ کرلیا۔ بالآخر پہلی جنگ عظیم کے بعد پورا مشرقِ وسطیٰ بھی عثمانیوں کے ہاتھوں سے نکل گیا اور صرف ترکی نام کا برائے نام ایک ملک رہ گیا۔

- اسی دوران میں یورپی اقوام کے ذریعے نادیدہ ہاتھوں نے سود کو حلال کر کے سودی نظام معیشت کی بنیاد ڈالی اور بنک آف انگلینڈ قائم کیا، مشرق کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی (E.I.C) قائم کی۔ یورپی اقوام میں صنعتوں کی تقسیم کر کے عالمی سطح پر MONOPLY کے لئے یورپ کو ایک کر کے برطانیہ کے تحت کر دیا۔ عیسائیت کو فروغ دیا گیا مسلمانوں کے ساتھ مذہبی میدان میں مقابلے کے لیے ان کی سرپرستی کی گئی۔

مشرقِ وسطی کے مسلمان علاقوں کو ہتھیانے کے لیے وطن اور وطن پرستی کا سیاسی نعرہ ایجاد کیا گیا اور قوموں کو رنگ، نسل اور علاقے کی بنیاد پر چھوٹی اور مرکز گریز اکائیوں کا سبق پڑھا کر الگ الگ ملک بنا دیا گیا جس کا نقشہ آج مشرقِ وسطی میں سامنے ہے۔

- نہ صرف سلطنت عثمانیہ ختم کر دی گئی بلکہ مسلمانوں کا سیاسی نظام نظامِ خلافت بھی ختم کر دیا گیا اور اس کو بدنام کیا گیا۔ برطانوی محکوم غلام قوم مسلمانوں نے جنوبی ایشیا میں بحالیٔ خلافت کی زبردست تحریک چلا کر دکھائی کہ مغربی سامراج چیخ اُٹھا۔
- 1776ء میں امریکہ میں نیو ورلڈ آرڈر کی بنیاد ڈالی گئی، سیکولرازم اور لبرل ازم کا نام لیا گیا۔ 1897ء میں سوئزرلینڈ میں نادیدہ قوتیں جمع ہوئی اور منشور منظور ہوا

(PROTOCOLS) جس نے انسانیت کُش اور علم و اخلاق کے خلاف انتہائی اقدامات کا سوسالہ منصوبہ سامنے لایا گیا اور جس پر عمل پیرا ہوکر آج مغربی اقوام امریکہ کی قیادت میں اپنے مقاصد کے حصول کی چوٹی سر کرنے کے قریب ہیں۔

- ہمارے نزدیک صرف مسلمان ایک نئے عالمی نظام کے راستے کی رکاوٹ ہیں اور صرف وہ مسلمان جو قرآن و حدیث اور دین سے دلچسپی رکھتے اور ذرا عمل کرتے ہیں اور آج صاف نظر آ رہا ہے کہ دنیا بھر میں جنگ کی جو کیفیت ہے اس میں غالب فریق کے ساتھ کون کون ہیں وہ سب کے سامنے ہیں اور مغلوب فریق جو مارا جا رہا ہے، جس کا خون بہایا جا رہا ہے، جس کو بے در کیا جا رہا ہے، بے وطن کیا جا رہا ہے اور انسانیت اور انسانی حقوق کے علمبردار اور چمپئن اس کیفیت میں کوئی مداوا کرنے کی بجائے مغلوب قوم مسلمانوں کو مزید مارنے اور ختم کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔

- ہمارے نزدیک 1897ء میں منظور کیا گیا وہ انسان دشمن منشور ہی دنیا بھر میں بے چینی، بدامنی، قتل و غارت کا واحد سبب ہے۔ ہمیں حیرت ہے کہ 1897ء کے اس عالمی اجتماع میں جہاں برطانوی ہند سے بھی نمائندے شریک تھے کوئی ایک انسان بھی ایک ایسا نہیں تھا جو باضمیر ہو اور جس کے سینے میں دردمند اور انسان دوست دل ہو کہ وہ اس انسانیت کش منصوبے کے خلاف آواز اٹھاتا اور یہ منصوبہ منظور نہ ہوتا۔ محسوس یہی ہوتا ہے کہ اس اجتماع میں کوئی ایک انسان ایسا ذی شعور اور باضمیر نہیں تھا جو اس وقت انسان دوستی کی صدا لگا سکتا۔ دنیا پر تیسری جنگ عظیم کی متوقع تباہی کا ٹائم بم 1897ء میں ہی گرا دیا گیا تھا جو ایک صدی کے بعد پھٹنے کو ہے۔ اب لوگ اپنی آنکھوں سے اس فکری ابلیسی بم کی ہلاکت خیزی اور انسانیت کُش حیثیت کا مشاہدہ کریں گے۔ اعاذنا اللہ من ذالک۔ یہ جنگ جیسا کہ مشہور ہے نیکی کی قوتوں اور بدی کی قوتوں کی مابین تاریخ انسانی کی سب سے بڑی جنگ ہونی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں نیکی کی قوتوں کے ساتھ جوڑے رکھے۔ آمین۔

پاکستان میں دہشت گردانہ سرگرمیوں کے اسباب کا جائزہ اور حل

پروفیسر (ر) عبد الخالق سھریانی بلوچ
کندھ کوٹ (سندھ) 03337303320

پاکستانی قوم اس وقت جن باغیانہ اور دہشت گردانہ سرگرمیوں کے ساتھ اندرونی سیاسی انتشار اور خلفشار سے دوچار ہے وہ نہایت افسوسناک ہے، اس سے ملک وملت کے استحکام اور بقا اور ملّی یکجہتی کو سخت نقصان پہنچا ہے اور ملک نہایت خطرناک حالات سے گذر رہا ہے۔

اس صورت حال کا آغاز صوفی محمد کی تحریک نفاذِ شریعت سے ہوا تھا، ان کی تحریک مقصد کے لحاظ سے تو صحیح تھی مگر طریقہ کار کے لحاظ سے اس کے نتائج برعکس نکلے۔ صوفی محمد کا مطالبہ ان علاقوں میں مسلم پرسنل لا کا نفاذ تھا جس کو اس وقت کی حکومت نے بھی تسلیم کرلیا تھا اور شرعی عدالتیں قائم کرنے کا نوٹیفکیشن بھی جاری ہوگیا تھا مگر اس پر عمل درآمد کو اچانک روک لیا گیا جس سے افراتفری پیدا ہوئی اور تحریک کے کارکن اور حکومت باہم دگر متصادم ہوگئے، اس طرح محبّ وطن قبائلی لوگوں کے ساتھ ایک طرح کی غیر علانیہ جنگ کا آغاز ہوگیا۔

اس دوران امریکہ میں 9/11 کا واقعہ رونما ہوا جس کی حقیقت سے اس دنیا کے سب لوگ واقف ہوگئے ہیں، اس واقعہ کو بہانہ بنا کر اسامہ بن لادن کو اس حملہ کا سرغنہ قرار دے کر اس کی تلاش کا کام جاری ہوگیا اور اس کو پاکستان کے قبائلی علاقوں میں پائے جانے کا خدشہ ظاہر کرتے ہوئے امریکہ کی جانب سے قبائلی علاقوں پر ڈرون حملوں کا آغاز کر دیا گیا جن میں ہزاروں بے گناہ قبائلی مسلمان شہید ہوگئے، ان کے گھروں حتیٰ کہ مساجد و مدارس تک کو مسمار کر دیا

گیا، مگر ان حملوں کو روکا نہ جا سکا۔ یہ صورت حال جاری ہی تھی کہ سابق صدر جنرل مشرف کے دور میں لال مسجد اسلام آباد کا واقعہ رونما ہوا جس میں کافی شہادتیں ہوئیں، مسجد کے تقدس کو نقصان پہنچا، اس واقعہ نے بھی صورت حال کو مزید گمبھیر بنا دیا حکومت اور سکیورٹی اداروں کے خلاف ناراضگی میں اضافہ ہوا۔ اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے پاکستان مخالف غیر ملکی قوتیں متحرک ہوگئیں انہوں نے اپنی ایجنسیوں کے ذریعے ملک کے اندر تخریب کاری کا منصوبہ بنالیا، مساجد و مدارس، اسکول اور کالجز، شہر اور بازاران کے حملوں کی زد میں آ گئے ان کی ان سرگرمیوں کا الزام قبائلی مسلمانوں پر لگایا گیا اس لئے ان پر حملے تیز کرنے کا مطالبہ امریکہ کی طرف کیا گیا۔

اس وقت پاکستان دنیا میں وہ ملک ہے جسے امریکہ کی پس پردہ حکمران صہیونی لابی نے دوستی کے پردے میں ایک نہ بجھنے والی آگ کی لپیٹ میں دھکیلا ہوا ہے۔ امریکہ کا الزام ہے کہ پاکستان دہشت گردی کا سب سے بڑا اڈہ ہے جس سے امریکہ اور دنیا کے دوسرے ممالک کو بڑا خطرہ ہے اس لیے جب تک پاکستان سے آخری دہشت گرد ہلاک نہیں کر دیا جاتا اس وقت تک امریکہ اور نیٹو افواج کو پاکستان پر اپنے حملوں کا سلسلہ جاری رکھنے کا حق حاصل ہوگا۔ اور اس بات کو بہانہ بنا کر پاکستان کی مالی امداد روکنے کے فیصلے کیے گئے ہیں اور اس امداد کو DO MORE سے مشروط کر دیا گیا ہے۔ صدر ٹرمپ کی جانب سے حالیہ اعلان کردہ پالیسی کے بعد صورت حال مزید خطرناک ہوجائے گی۔

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اس وقت متحارب گروہوں کی تعداد 50-60 سے متجاوز ہوچکی ہے۔ میری عاجزانہ رائے یہ ہے کہ ان متحارب گروہوں کی نصف تعداد ضرور ان ہی لوگوں پر مشتمل ہوگی جو پاکستان کی سرحدوں کے محافظ اور پکے مسلمان قبائلی لوگ تھے، جو ہماری سابقہ پالیسیوں کی وجہ سے معتوب ہوئے، ان کو سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، ان کے اموال اور گھر تباہ ہوگئے اس لئے انہوں نے تنگ آمد بجنگ آید کے اصول کے مطابق اپنی کارروائیاں شروع کیں۔

اس بات کا ایک واضح ثبوت یہ ہے کہ پاکستان کے سابق وزیر داخلہ نے کئی مرتبہ اپنے بیانات میں اچھے طالبان وغیرہ کے الفاظ بھی استعمال کیے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد محبّ وطن پاکستانی قبائلی لوگ تھے۔

پھر ایک دور ایسا بھی گذرا ہے کہ حکومت پاکستان کے ایما پر پاکستان کی مقتدر دینی شخصیات نے اس تصادم کو روکنے کے لیے ان سے مذاکرات شروع کیے، ان مذاکرات سے اُمید افزا حالات پیدا ہو رہے تھے اور معاملات سلجھنے کے قریب آئے تو اچانک مذاکرات روک لیے گئے اور فریق مخالف پر حملوں کا آغاز کر دیا گیا اور یہ تصادم اب تک مختلف صورتوں میں ملک میں جاری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم جذبات کی رو میں بہہ گئے اور اپنوں اور حقیقی دشمنوں میں تمیز کرنے سے قاصر ہو گئے اس طرح ہم ایک نہ ختم ہونے والی خانہ جنگی میں مبتلا ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ جب تک ہم ناراض محبّ وطن پاکستانی قبائلیوں اور دشمن کی جانب سے بھیجے گئے تخریب کاروں میں فرق نہ کریں گے تو پھر یہ جنگ کبھی ختم نہ ہو سکے گی اور ہم اپنی تباہی کا سامان اپنے ہی ہاتھوں سے کرتے رہیں گے۔ اب اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے سنجیدہ ہونے کی ضرورت ہے۔

مذکورہ صورت حال میں افواجِ پاکستان کو ملک کے اندرونی امن وامان کے مسائل حل کرنے کے لئے ذمہ داری سونپی گئی ہے، حالانکہ یہ کام افواجِ پاکستان کا نہیں ہے ان کی اصل ذمہ داری ملک کی سرحدوں کی حفاظت ہے جو آج کل نہایت ہی نازک ہو گئی ہے۔ افواجِ پاکستان کی جانب سے کیے گئے اقدامات ضربِ عضب اور ردّ الفساد کی مہمّیں جاری ہیں، ان کے ذریعے بڑی حد تک ملک میں امن وامان بحال ہو گیا ہے، اس کام میں افواجِ پاکستان کو بڑی قربانیاں دینی پڑی ہیں، مگر مسئلہ کا اصل اور مستقل حل یہ نہیں ہے۔

میں انتہائی ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ جب بھی افواجِ پاکستان ان مہموں سے فارغ ہو کر واپس چلی گئیں تو پھر خدانہ کرے کہ سابقہ فتنے اور فساد زیادہ طاقت سے اُبھر کر سامنے نہ آجائیں جن کو روکنا حکومتی انتظامات سے ممکن نہ ہوگا۔ یہ صورت حال جب بھی پیش آئی ملک کے لئے نہایت خطرناک ثابت ہوگی۔ العیاذ باللہ

پاکستان کے اندرونی خلفشار کا دوسرا سب سے بڑا سبب مسلکی فرقہ واریت اور انتہا پسندی ہے۔ یہ وبا پاکستان میں اس حد تک پھیل چکی ہے کہ اب پاکستان کے مسلمان فرقے ایک دوسرے کو مسلمان سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہیں، یہ گروہ اور فرقے دوسرے ممالک میں بھی

موجود ہیں مگر وہاں پر ایسی صورت حال نہیں ہے، خود ہندوستان میں یہ سب فرقے موجود ہیں مگر وہاں پر یہ تصادم اور ایک دوسرے پر حملوں کا کوئی وجود نہیں ہے۔

یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ پاکستانی حکمرانوں نے ان مختلف فرقوں کی سرگرمیوں پر کوئی توجہ نہیں دی، ان کی فرقہ وارانہ تنظیموں کے خلاف کوئی اقدام کرنے سے گریز کرتے رہے، کیونکہ ان کو ان فرقوں کے ووٹ حاصل کرنے کی ضرورت تھی۔ جب یہ پودے تناور درخت کی صورت اختیار کر گئے اور ان کی سرگرمیوں سے ملک کا امن وامان خطرے میں پڑ گیا تو پھر نیشنل ایکشن پلان بنانے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ حالانکہ یہ اقدام اس وقت ہونا ضروری تھا جب فرقہ وارانہ نرسریوں کا آغاز ہو رہا تھا، مگر سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے اس سے اغماض برتا اور ہم اس وقت بیدار ہوئے جب یہ بات ہمارے ہاتھوں سے نکل چکی ہے۔ اب کوئی اصلاحی تدبیر مؤثر ثابت نہیں ہو رہی اور ہم ان فرقوں کے سامنے بے بس ہو کر رہ گئے ہیں۔

پاکستان میں ملک دشمن سرگرمیوں کو ہوا دینے کے اسباب میں تیسرا بڑا سبب پاکستان کے مختلف صوبوں کے غریب عوام کے ساتھ ناانصافی اور حقوق سے محرومی بھی ہے، اس احساسِ محرومی کے جذبات کو ابھار کر ان صوبوں کے قوم پرست اور موقع پرست سیاست دانوں نے صوبائی عصبیت کو ہوا دی اور ان کو اسلام اور پاکستان سے نفرت دلانے کی مہمیں چلائی تھیں اور عوام کو یہ تاثر دیا گیا تھا کہ یہ سب ناانصافیاں اور ظلم اسلام اور پاکستان کے نام پر ملک کے حکمراں آپ پر کر رہے ہیں، اس لئے اب اسلام اور پاکستان سے کسی بھی طرح نجات حاصل کرنے کی جدوجہد کی جائے، اس سلسلہ میں انہوں نے ماضی میں دشمن ملکوں کا تعاون حاصل کرنے کے لئے بھی کوششیں کیں۔ ان ہی بنیادوں پر مشرقی پاکستان میں لسانی اور معاشی حقوق کے حوالہ سے تحریک چلائی گئی تھی، ہندوستان سے مدد لی گئی یہاں تک کہ میں مشرقی پاکستان کا سقوط ہو گیا۔

یہ سب کچھ ہماری نااہلی اور سیاسی قیادت کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے ہوتا رہا ہے مگر ہم نے اس سے بھی کوئی سبق نہ سیکھا اور ہم وہی غلطیاں دہراتے رہے جن کی وجہ سے ہم پہلے بھی خسارہ اٹھا چکے تھے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ ہمارے حکمران طبقے کے لوگ لاشعوری طور پر اپنی ان غلطیوں

کا اعتراف بھی کرتے رہے ہیں مگر ان کا صحیح طور پر ازالہ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔اس کی ایک واضح مثال پاکستان کے ایک سابق وزیراعظم محترم یوسف رضا گیلانی کا وہ اعلان جو ریکارڈ پر بھی موجود ہے کہ ہم اب بلوچستان کے لوگوں کو ان کے حقوق دینے کا آغاز کررہے ہیں۔اس منصوبہ کا نام بھی آغاز حقوق بلوچستان رکھا گیا۔

اس اعلانِ اعتراف سے یہ بات صاف ظاہر اور ثابت ہورہی تھی کہ ہم نے 70 برس تک بلوچستان کے عوام کو اپنے جائز سیاسی ومعاشی حقوق سے اب تک محروم رکھا تھا اس لئے اس کا ازالہ کرنے کے لئے ان کو حقوق دینے کا آغاز اب کررہے ہیں۔گویا کہ ہم اپنے کیے گئے ظلم کا اعتراف کررہے ہیں پھر مختلف ادوار میں صوبوں کو امداد دینے کا وہ طریقہ کار اختیار کیا جاتا رہا جس سے صوبوں کے سیاسی لیڈروں،صوبائی حکمرانوں، وڈیروں اور سرداروں اور بیوروکریسی نے ہی فائدہ اٹھایا اور عوام تک اس کے ثمرات پہنچ نہ سکے۔اسی صورت حال میں علیحدگی کی تحریکوں کو قوت ملتی رہی اب ان کا نتیجہ ہمیں باغیانہ اور دہشت گردانہ سرگرمیوں کی صورت میں مل رہا ہے۔

چوتھا سبب، افواجِ پاکستان کو ضربِ عضب اور ردّ الفساد کی مہموں میں عوامی اور متعلقہ سرکاری اداروں کی رہنمائی اور مدد کی سخت ضرورت ہے بظاہر اس میں بڑی کمی نظر آرہی ہے۔ سرکاری اداروں کے عدمِ تعاون کا سبب صوبائی حکومتوں کی سیاسی مصلحت ہے اور عوامی حمایت میں کمی کا سبب ڈر اور خوف ہے۔اس سلسلہ میں خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔

متذکرہ صورت حال میں اس وقت پاکستان کے حالات نہایت گمبھیر ہوچکے ہیں، امریکہ، اسرائیل، ہندوستان اور افغانستان کی متحدہ جدوجہد پاکستان کے خلاف ظاہر ہوچکی ہے بدقسمتی سے ایسی صورت حال میں جبکہ اندرونی حالات نہایت مخدوش اور اندرونی سیاسی کشمکش بھی عروج پر ہے، ان حالات میں قوی امکان اس بات کا ہے کہ دشمن ہمارے اندرونی حالات اور ناکام خارجہ پالیسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستان پر اچانک حملہ نہ کردے جبکہ اس حملے کا پہلا حدف کشمیر ہی ہوگا، ہندوستان کی جانب سے .L.O.C کی مسلسل خلاف ورزیاں ثابت کررہی ہیں کہ ان کے عزائم بالکل خطرناک ہیں،ان حالات میں ان کی جانب سے کوئی بڑا جارحانہ اقدام غیر متوقع نہیں ہے۔حیرت کی بات یہ ہے کہ ہندوستان کی جانب سے یک طرفہ مسلسل .L.O.C

کی خلاف ورزیوں کے خلاف دنیا سے کوئی آواز نہیں اٹھ رہی حتیٰ کہ ہمارے دوست مسلم ممالک بھی اس سلسلہ میں بالکل خاموش نظر آ رہے ہیں۔

متذکرہ صورت حال کے پس منظر میں چند اصلاحی تجاویز پیش خدمت ہیں:

☆ اس اپیل کے ساتھ عام معافی کا اعلان کر دیا جائے کہ جو محبّ وطن پاکستانی قبائلی گروہ کسی وجہ سے ناراض ہیں وہ ملک کے مفاد کی خاطر مذاکرات کے لئے رضامند ہو جائیں تا کہ ان کی شکایات کا ازالہ کیا جا سکے۔ اس طرح ان کو قومی دھارے میں دوبارہ لانے کی کوشش کی جائے۔ امید ہے کہ ان کے مذاکرات پر آمادہ ہو جانے سے بڑی حد تک منفی سرگرمیوں کا ازالہ ہو جائے گا۔

☆ ملک کے اندر فرقہ پرست گروہوں کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھی جائے اور ملک کے نامور علمائے دین جو فرقہ پرستی کے خلاف ہیں ان سے فرقوں کے باہمی اتحاد اور ہم آہنگی کے لئے مدد لی جائے۔ اس سلسلہ میں ان کا ایک بورڈ بنایا جائے۔ اس کے ساتھ نیشنل ایکشن پلان کو مضبوطی سے نافذ کیا جائے۔

☆ اسلامی نظامِ عدل کے مطابق ملک کے صوبوں کے عوام کو ان کے علاقائی حقوق دینے کو یقینی بنایا جائے تا کہ ان کا احساسِ محرومی ختم ہو سکے، اس سلسلے میں ایسے اقدامات کیے جانے ضروری ہیں جن سے صوبوں کے وڈیروں، سرداروں، سیاسی لیڈران، صوبائی سربراہانِ حکومت اور بیوروکریسی ان مراعات کا استحصال نہ کر سکیں اور حکومتی مراعات اور اصلاحات کا فائدہ براہِ راست صوبوں کے غریب عوام کو حاصل ہو سکے۔

☆ افواج پاکستان کو اپنی مہموں کے سلسلے میں عوام اور متعلقہ سرکاری اداروں کی جانب سے مکمل اور مؤثر رہنمائی اور تعاون فراہم کیا جائے۔

مرا طریق امیری نہیں ، فقیری ہے
خودی نہ بیچ ، غریبی میں نام پیدا کر!

فکرِ اقبال کی روشنی میں
نظامِ تعلیم کے خدوخال

ڈاکٹر محمد حسین

جوہر آباد

قرآن اکیڈمی جھنگ میں 23/اپریل 2017ء کو منعقد ہونے والے ایک اہم سیمینار بعنوان: ''فکرِ اقبال کی روشنی میں (21ویں صدی میں ایک جدید اسلامی نظریاتی فلاحی عوامی ریاست) پاکستان کے نظامِ تعلیم کے خدوخال'' میں مہمان مقرر جناب ڈاکٹر محمد حسین صاحب (جوہر آباد) نے جن خیالات کا اظہار کیا، وہ ہدیۂ قارئین ہیں۔ (ادارہ)

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

صدرِ مجلس اور معزز مہمانانِ گرامی! میں بہت شکر گزار ہوں جناب انجینئر مختار حسین فاروقی صاحب کا کہ انھوں نے مجھ جیسے ایک مدرّس کو یہاں اپنی بہت ہی بلند اکیڈمی میں حاضر ہونے اور آپ احباب سے گفتگو کرنے کا موقع عطا فرمایا۔ جھنگ بڑا پیارا شہر ہے، میں پہلے بھی بہت دفعہ جھنگ آتا رہا ہوں، لیکن آج میں کچھ باتیں کرنے کے لیے آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔ میں علامہ اقبال کا ماہر آدمی نہیں ہوں بلکہ فزکس اور سائنس کا استاد رہا ہوں اور ساری زندگی سائنس کے اساتذہ کے ساتھ ان کی ٹریننگ اور تربیت کے کام میں مصروف رہا، لیکن بچپن سے علامہ اقبال سے محبت ہے، علامہ اقبال کے خاص طور پر اُردو کلام کو پڑھتا رہا ہوں اور سمجھ آئے یا نہ آئے' اس سے لطف لیتا رہا ہوں۔ میں اپنے آپ کو علامہ اقبال کے کلام اور ان کے فکر و خیال کا کوئی ماہر نہیں سمجھتا لیکن بہر حال ایک مدرّس کی حیثیت سے آپ کے سامنے چند باتیں رکھوں گا

شاید آپ سمجھیں کہ کچھ ان میں RELEVANCE ہے۔

سب سے پہلے تو میں آپ کے سامنے یہ بات رکھوں گا کہ علامہ اقبال کے کلام سے جو میں نے نکات وتصورات اخذ کیے ہیں جن کا تعلق تعلیم سے بنتا ہے، وہ کیا ہیں؟ ان میں سب سے پہلے ہے خودی۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب نے اس پر بہت وضاحت کے ساتھ لکھا اور یہ کہ کس طرح ہم خودی کا TRANSLATE تعلیم کے اندر کریں گے۔ میں اس کی تفصیلات میں نہیں جاتا کہ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے لیکن ایک بنیادی تصور ہے خودی کا، جو علامہ اقبال نے اپنے کلام میں دیا اور وہ چاہتے ہیں کہ فرد کے اندر بھی اور معاشرے کے اندر بھی خودی کا جذبہ، خودی کا احساس، خودی کا کردار پیدا ہو۔ دوسری بات جس کا انہوں نے اپنے پورے کلام میں ذکر کیا وہ اتحادِ امت ہے۔ تیسرا تو قیر ذات۔ چوتھا تو قیر علم۔ پانچواں تو قیر اساتذہ۔ اور حریتِ فکر۔ اور حریتِ فکر کے لیے علامہ اقبال نے کلامُ اللہ اور سیرتِ رسول ﷺ کو بنیاد قرار دیا ہے اور یہ اللہ کا کلام اور سیرتِ رسول ﷺ حریت فکر پر قدغن نہیں لگاتیں، یہ اس کے لیے کسوٹی مہیا کرتی ہیں۔ یہ اس کے لیے تحدید نہیں کرتیں یہ اس کی تصدیق کے لیے ہیں۔ کسی معاشرے میں، کسی فرد میں، کسی ادارے میں جو حریتِ فکر ہے اگر وہ قرآن وحدیث کی تعلیمات کے مطابق ہے تو ٹھیک ہے اس کے مطابق نہیں ہے تو وہ غلط ہے۔ حریتِ فکر علامہ اقبال کے مطابق کوئی بالکل آزاد چیز نہیں اس کے PARAMETERS ہیں اور وہ PARAMETERS قرآن وحدیث ہیں یعنی اللہ کا کلام اور سیرتِ رسول اللہ ﷺ۔

اس کے بعد میں نے یہ دیکھا کہ علامہ اقبال کے اُردو کلام میں تو یہ ساری باتیں ہیں لیکن بنیادی طور پر علامہ اقبال کا فارسی کلام، جو ہمارے اداروں میں، ہمارے دانشوروں میں اور ہمارے ملک میں ایک لحاظ سے بالکل ہی معدوم ہے۔ بڑے عرصے تک میں علامہ اقبال کا فارسی کلام (کلیاتِ اقبال) ڈھونڈتا رہا اور مجھے بڑی پریشانی ہوئی کہ مجھے یہ بک بڑے عرصے تک اقبال اکیڈمی سے بھی نہ ملی، یہ صورت حال ہے! جبکہ علامہ اقبال کا جو اصل کلام ہے جس میں کوئی بات فلسفے کی بنیاد پر کہی گئی ہے وہ فارسی میں ہے۔ علامہ اقبال کا فارسی کلام اگرچہ میں نے بہت زیادہ نہیں پڑھا، خود میں نے میٹرک تک فارسی پڑھی ہے البتہ مجھے فارسی کلام کی سمجھ آتی ہے۔

اسرارِ خودی اور رُموزِ بے خودی کو میں نے خاص طور پر دیکھا اور اس میں سے جو تصورات تعلیم کے حوالے سے میرے سامنے آئے وہ میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ یہ 21 نکات ہیں۔ ان کو سامنے رکھ کر تعلیم کے شعبے کو آگے بڑھنا چاہیے۔ ان کی بہت تفصیلات ہیں میں صرف نکات بیان کر رہا ہوں:۔

☆ نظامِ کائنات کی بنیاد خودی ہے اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کا تعین اور ان کا ارتقاء خودی کے استحکام پر منحصر ہے۔ خودی کے بغیر یہ کام آگے نہیں چلتا۔

☆ خودی کی زندگی مقصد کے بغیر نہیں ہے۔ اگر مقصدِ زندگی نہیں تو خودی آ ہی نہیں سکتی۔ لہٰذا زندگی کا مقصد ضروری ہے۔ جس طرح قرآن کریم میں ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ O اللہ نے جنوں اور انسانوں کی تخلیق کا مقصد بتایا کہ عبادت ہے، اور اگر یہ مقصد پورا نہیں ہوتا تو زندگی کوئی نہیں۔ علامہ اقبال بھی یہی کہتے ہیں کہ خودی کی زندگی مقصد سے ہے اگر زندگی مقصد سے عاری ہے تو وہ زندگی کوئی نہیں۔

☆ خودی عشق و محبت سے مستحکم ہوتی ہے۔ کس کا عشق اور کس کی محبت؟ اللہ کا عشق اور اللہ کے رسول ﷺ کا عشق، اللہ کی محبت اور اللہ کے رسول ﷺ کی محبت۔ وہ محبت نہیں جو ہم نعتوں میں محض نعرے لگاتے ہیں۔ اس محبت سے مراد اِتباع اور عمل ہے۔ جب تک ہم محبت کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کے احکامات کا اتباع نہیں کریں گے اس وقت تک خودی نہیں آسکتی اور ظاہر ہے اس کو تعلیم کا بنیادی حصہ ہونا چاہئے۔

☆ سوال کرنے والا، سوالی یا محتاج کبھی خودی کا حامل نہیں ہوسکتا۔ جو دوسروں سے سوال کرے گا جو دوسروں سے مانگے گا، چاہے وہ مال مانگے چاہے علم مانگے، وہ کبھی خودی کا حامل نہیں ہوسکتا۔

☆ خودی عشق و محبت سے مستحکم ہوتی ہے تو وہ نظامِ عدل کی ظاہری اور مخفی قوتوں کو مسخر کرلیتی ہے۔ میں اس کی مثال یہ دیتا ہوں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کون سے MANAGEMENT کے لیکچر ATTAND کیے تھے؟ کون سے کالج ATTEND کیے تھے؟ اللہ کے رسول ﷺ سے قرآن ہی تو پڑھا تھا۔ دنیا کے بہترین جرنیل، بہترین منیجر، بہترین

گورنر، بہترین حاکم کیسے پیدا ہو گئے۔ یہ جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا اور قرآن وحدیث کا عشق ومحبت ہے اس سے ساری صلاحیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

☆ علامہ اقبال خودی کے ہی حوالے سے فرماتے ہیں کہ خودی کی نفی کا معاملہ اقوامِ مظلوم کی اختراع ہے تاکہ وہ اس مخفی طریقہ سے اقوامِ غالبہ کے اخلاق کو کمزور کریں۔ اور اسی خودی کے حوالے سے علامہ اقبال فرماتے ہیں: ''افلاطون، جس کے افکار سے تصوف اور مسلم اقوام کے ادب نے بہت اثر لیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کے EARLY PERIOD میں یونانی فلسفے کے تراجم کیے گئے اور اس طرح مسلمانوں نے اس سے استفادہ کیا۔ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ وہ مسلک ایک گوسفندی کا پیروتھا۔ وہ بھیڑ کا پیرو ہونے کی بات تھی۔ یونانی اور افلاطون کے فلسفے نے مسلمانوں کو بھیڑ بنا کر رکھ دیا اور مسلمانوں کے اندر جو تخیلات کی بلندی ہونی چاہئے تھی وہ اس کی وجہ سے ختم ہوئی۔

☆ علامہ اقبال خودی کی تربیت کے تین مرحلے بتاتے ہیں: پہلا مرحلہ ہے اطاعت۔ کس کی اطاعت؟ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت۔ دوسرا ہے ضبطِ نفس۔ اور تیسرا ہے نیابت الٰہی۔ اس کے بغیر خودی پیدا نہیں ہوتی۔ اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابت الٰہی سے ہی خودی پیدا ہوتی ہے۔

☆ خودی کے حوالے سے علامہ اقبال لکھتے ہیں کہ ملت اسلامیہ کی زندگی کا تسلسل .....اپنی مخصوص روایات پر جمے رہنے سے ہے۔ جونہی آپ اپنی روایات کو چھوڑیں گے جو آپ کی دینی روایات ہیں جو آپ کی ثقافتی روایات مذہب سے ہی پھوٹتی ہیں ان کو آپ چھوڑیں گے تو آپ کی خودی مجروح ہوگی۔

☆ مسلمانوں کی زندگی کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔ اگر جہاد کا محرک ملک فتح کرنا ہے تو علامہ اقبال کے مطابق ایسا جہاد حرام ہے۔ جہاد صرف اللہ کی رضا کے لیے ہوتا ہے جہاد صرف اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کے لیے ہوتا ہے، دنیا کو فتح کرنے کے لیے نہیں ہوتا۔ اگر ہم اس نقطۂ نظر کو موجودہ حالات پر منطبق کریں تو ہمیں جو انتہا پسند کہا جاتا ہے شاید اس بات کو بھی ہم دھو سکیں۔

☆ ملت افراد کے اختلاط سے وجود میں آتی ہے اور اس کی تربیت کی تکمیل نبوت سے

ہے۔یعنی جب تک اتحادِ اُمت پیدا نہیں ہوتا اور اس اتحادِ امت کی بنیاد ہے نبوت کی تعلیم ،اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی تعلیم ۔اور اگر یہ ہمارے پاس آ جائیں تو پھر فرد میں بھی خودی پیدا ہوگی اور معاشرے میں بھی خودی پیدا ہوگی۔

☆ رسالتِ محمدیہ ﷺ کا مقصد بنی آدم کی آزادی، مساوات اور اخوت کی تشکیل و تاسیس ہے اور یہی خودی کی بنیاد ہے۔

☆ ملتِ اسلامیہ زمان ومکان اور وطن سے آزاد ہے۔یعنی ملتِ اسلامیہ کا وطن صرف پاکستان ہی نہیں، ہے امریکہ بھی ہمارا وطن ہے۔ملتِ اسلامیہ آج ہی نہیں آج سے ہزاروں سال پہلے بھی تھی اور یہ ہزاروں سال بعد میں بھی ہوگی۔نہ اس کا کوئی وطن ہے نہ اس کا کوئی زمان ہے نہ اس کا کوئی مکان ہے۔یہ اللہ کا حکم ہے یہ اللہ کے رسول ﷺ کا نقطۂ نگاہ ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی کوئی تحدید نہیں ہوسکتی۔اور یہی انسانی خودی کی بنیاد ہے۔

☆ کسی بھی ملت کا نظام آئین کے بغیر قائم نہیں ہوسکتا اور ملت اسلامیہ کا آئین قرآن ہے۔آپ دیکھ رہے کہ اس وقت پوری دنیا میں اور خاص طور پر ہمارے ملک میں جو جھگڑ چل رہے ہیں۔ابھی ڈاکٹر طالب حسین سیال صاحب اور فاروقی صاحب بتا رہے تھے کہ پاکستان کا قیام ہی علامہ اقبال کی وجہ سے ہے، یہ تصور پیش ہی انہوں نے کیا تھا اور وہی فرما رہے ہیں کہ کسی بھی ملت کا نظام آئین کے بغیر قائم نہیں ہوسکتا اور ملت اسلامیہ کا آئین تو صرف قرآن ہے۔

ایک اور عجیب بات ہے شاید ڈاکٹر ابصار صاحب اس کو وضاحت سے ہمیں سمجھا سکیں کہ

☆ دورِ انحطاط میں تقلید اجتہاد سے بہتر ہے۔اس وقت ہم دورِ انحطاط میں سے گزر رہے ہیں تو شاید اس حوالے سے ہمارے لیے تقلید اجتہاد سے بہتر ہے۔اس سے میں یوں سمجھا کہ شاید اجتہاد کے لیے جو KNOWLEDGESTAMNET اور ذہنی ماحول ہے وہ ہمارے پاس میسر نہیں ہے، ہم مغرب زدہ ہو چکے ہیں اور مغربی تہذیب وثقافت کے اندر ہم ڈوب چکے ہیں اس لیے اگر ہم اجتہاد کریں گے تو شاید اپنی حدود سے باہر نکل جائیں گے لہٰذا فی الحال جب تک ہم اپنے ان حالات کو چینج نہیں کرتے تو تقلید ہی ایک بہتر راستہ ہے۔

☆ کردار کی پختگی شریعت کی اِتباع سے ہے۔علامہ اقبال 'رموزِ بے خودی' میں فرما رہے

ہیں کہ انسان کے کردار کی پختگی صرف شریعت کے اوپر عمل کرنے سے ہے اس کے علاوہ کسی طریقے سے کردار پختہ نہیں ہوسکتا۔

☆ ملت کا حسنِ سیرت رسول اللہ ﷺ کے اُسوۂ حسنہ میں ہے۔ یہ ملت اسوۂ حسنہ پر عمل کرے گی تو ان کا کردار خوبصورت بنے گا ان کا کردار اچھا لگے گا ان کا کردار پسندیدہ کردار ہوگا۔

☆ ملت کی زندگی ایک مخصوص مرکز کا تقاضا کرتی ہے۔ دنیا کی کوئی بھی ملت ہو اس کا ایک مخصوص مرکز ہوتا ہے۔ ہمارا مخصوص مرکز کون سا ہے؟ بیت الحرام، بیت الحرام کو ہی مرکز مانیں گے۔ اس کا تحفظ، اس کی عزت، اس کا احترام، اس کا وقار ہمارے دلوں میں ہوگا تو مسلمانوں کے اندر اتحاد بھی پیدا ہوگا اور ایک احترام اور وقار بھی پیدا ہوگا۔

☆ ملت کی اصل قوت نصب العین کو تھام لینے میں ہے۔ جب تک نصب العین واضح نہ ہو اور نصب العین کو تھاما ہوا نہ ہو تو ملت کو قوت حاصل نہیں ہوتی۔ امت محمد یہ ﷺ کا نصب العین کیا ہے؟ توحید کی تفہیم اور اشاعت۔ علامہ اقبال کے مطابق امت محمد یہ ﷺ کے جو بنیادی نصب العین ہیں وہ توحید کی تفہیم اور اس کی اشاعت ہے۔ اور ہم اسی میں کمزور پڑ گئے ہیں۔

☆ کسی بھی ملت کی توسیع اور استحکام فطرت کی تسخیر سے ہے۔ جسے ہم سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کہتے ہیں۔

☆ علامہ اقبال کے جو نظریات میں پیش کر رہا ہوں ان میں سے آخری نکتہ یہ ہے کہ ملّی زندگی کا کمال یہ ہے کہ ملت بھی فرد کی طرح خودی کا احساس پیدا کرے۔ جس طرح فرد میں خودی کا احساس ہوتا ہے اسی طرح پوری ملت اور پورے معاشرے کے اندر خودی کا احساس پیدا ہونا چاہیے۔ اور اس احساس کا پیدا ہونا اور تکمیل پانا بھی ان روایات کی حفاظت سے ہی ممکن ہے۔ پہلے بھی میں عرض کر چکا کہ ملّی روایات کی حفاظت کی جائے گی اور ملّی روایات سے مراد ہندوانہ روایات نہیں بلکہ اسلامی روایات ہیں۔ ملّی روایات کی حفاظت کی جائے گی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فرد کے اندر بھی خودی کا احساس پیدا ہوگا اور معاشرے کے اندر بھی یہ احساس پیدا ہوگا۔ یہ تو خیر میں نے آپ کے سامنے چند نکات پیش کیے جو میں نے علامہ اقبال کے فارسی کلام سے اخذ کیے ہیں۔

یہ ساری چیزیں بیان کرنے کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبال کے ان تمام تصورات کو انسان کی شخصیت کا حصہ بنانے کا وسیلہ کیا ہے؟ اقبال کے ان تمام تصورات کو انسان کی شخصیت کا حصہ بنانے کا وسیلہ بنیادی طور پر تعلیم ہے۔ تعلیم کے علاوہ اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔ تعلیم کے بنیادی طور پر تین عناصر ہیں: معلم، متعلّم اور نصاب و کتاب۔ متعلّم تو وہ ہدف ہے کہ جس کے اندر ہم نے علامہ اقبال کی یہ تعلیمات پیدا کرنی ہیں جن کا ذکر کیا ہے، جن کو ہم تعلیم کا بنیادی عنصر کہتے ہیں۔ ہمیں علامہ اقبال کے نظریات کی ترجمانی کرنی ہوگی اور ان کو منعکس کرنا ہوگا نصاب اور کتاب کے اندر بھی جو ہم بچوں کو پڑھاتے ہیں اور معلم کے اندر بھی جس نے یہ منتقل کرنا ہے۔ نصاب اور کتاب کے اندر یہ نہ بھی منعکس ہو تو شاید گزارا ہوتا ہے، لیکن معلم کے اندر اس کو منعکس کرنا انتہائی ضروری ہے۔ اگر معلم علامہ اقبال کی تعلیمات کا چلتا پھرتا نمونہ نہیں ہوگا تو وہ ان باتوں کو اپنے شاگردوں میں کبھی بھی منتقل نہیں کر پائے گا، کتاب اور نصاب ہوگا تو آسانی ہوگی، نہیں ہوگا تو فرق نہیں پڑے گا، معلم منتقل کر دے گا۔ تو یہ بنیادی کام ہے جو ہمیں کرنا ہے کہ علامہ اقبال کی تعلیمات کو پورے نصاب کے اندر منعکس کرنا ہے TRANSLATE کرنا ہے اس کی ترجمانی کرنی ہے اور ان کو نافذ کرنا ہے وہ نصاب چاہے سائنس کا ہو، سوشل سائنسز کا ہو، اردو کا ہو، انگریزی کا ہو کسی بھی مضمون کا ہو، وہ چاہے سیکنڈری لیول کا ہو، ہائیر ایجوکیشن کا ہو، پی ایچ ڈی لیول کا ہو، ہر سطح پر اس کو TRANSLATE کرنا ہوگا یہ ایک ہماری بنیادی ضرورت ہے۔

اب بعض اوقات ہوتا یہ ہے کہ جو تعلیم کے مقامات ہیں مثلاً بلڈنگ یا جو سہولیاتِ تعلیم ہیں مثلاً بلڈنگ کے اندر جو سامان وغیرہ موجود ہے یا جو انتظامیاتِ تعلیم ہیں جس کا پورا ایک STRUCTUR SYSTEM ہے، ہم اس کو نظامِ تعلیم سمجھ لیتے ہیں حالانکہ وہ نظامِ تعلیم نہیں ہے، وہ نظامِ تعلیم کو سہولیات پہنچانے والا ایک نظام ہے، نظامِ تعلیم کو نافذ کرنے کا ایک راستہ ہے۔ نظامِ تعلیم BASICALLY نصاب، کتاب اور معلم ہیں اور بدقسمتی یہ ہے کہ ہم ان تینوں پر توجہ نہیں دے رہے۔ زیادہ توجہ بلڈنگ پر اور سہولیات پر اور لیپا پوتی پر ہوتی ہے جو آپ تعلیمی اداروں کے اندر دیکھتے ہیں۔ ہمارا بنیادی کام یہ ہوگا کہ ہمیں علامہ اقبال کے نظریات کو نصاب اور کتاب کے اندر TRANSLATE کرنا ہے اور استاد کی ٹریننگ کرنی ہے اس حوالے سے کہ

علامہ اقبال کا چلتا پھرتا نمونہ نظر آئے۔

اب تک جو میں نے آپ کے سامنے کہا، کیا یہ ممکن ہے؟ آپ لوگ شاید مجھ سے زیادہ اس ماحول کو، ان تعلیمی اداروں کو، ان کے نظام تعلیم کو اور اساتذہ کو جانتے ہیں۔ یہاں پروفیسر حضرات، پرنسپل حضرات اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ بیٹھے ہیں، جو کچھ میں نے کہا کیا یہ ممکن ہے؟ میری رائے میں یہ ممکن نہیں ہے۔ کیوں ممکن نہیں ہے؟ بنیادی وجہ میں آپ کو پڑھ کر سنادوں

BECAUSE EDUCATIONS HAS BECOME EDUCATIONAL ENTERPRISE OPERATING IN FREE MARKET ECONOMY

تعلیم، تعلیم نہیں رہی، تعلیم ایک کاروبار بن چکا ہے، اب آزاد منڈی کے اندر یہ سارا کام ہو رہا ہے۔ جو زیادہ چمک دکھائے گا جس کے اندر زیادہ خوبصورتی ہوگی، جس کے ہاں زیادہ آزادی ہوگی، جس کے ہاں زیادہ اختلاطِ مرد و زن ہوگا اُسی کا کام چلے گا دوسروں کا کام نہیں چلے گا۔ پچھلے دنوں میں اسلام آباد میں ایک یونیورسٹی کے کیمپس میں بیٹھا تھا اصلاح یونیورسٹی حیدرآباد کی ہے اور اس کا کیمپس اسلام آباد میں ہے۔ میں نے پوچھا آپ کی فیس کتنی ہے اور آپ کی INVOLVEMENT کتنی ہے؟ مجھے سن کے بڑی حیرانی ہوئی کہ اصلاح یونیورسٹی اتنے عرصہ کی بنی ہوئی ہے یہ کل کی یونیورسٹیاں بھری پڑی ہیں اور ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہے فیسیں بھی ان کی بہت کم ہیں اور INVOLVEMENT بھی نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ کیسے ہوگی؟ ایک تو ہمارے ہاں چمک دمک نہیں ہے، دوسرا یہ کہ ہم لڑکوں اور لڑکیوں کو اکٹھا نہیں بیٹھنے دیتے، سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ آزادی ہو، پڑھنا ہے تو پڑھو، نہیں پڑھنا تو جاؤ۔ اب ظاہر ہے نوجوان لڑکیاں لڑکے پڑھنے نہیں آتے وہ تو موج میلے کے لیے آتے ہیں اور موج میلہ جہاں زیادہ ہوگا وہاں داخلہ زیادہ ہوگا۔ یہ کوئی چند سال پہلے کی بات ہے کہ محمد علی جناح یونیورسٹی ..... نے اسلام آباد میں کیمپس کھولا، داخلہ نہیں ہو رہا تھا میاں عامر بہت حیران ہوا۔ بالآخر انہوں نے وہاں پر فرنٹ آفس میں ACTRESS نرگس بٹھا دی تو داخلہ دھڑا دھڑ شروع ہو گیا۔ اب اگر تعلیمی اداروں یونیورسٹیوں، کالجوں اور سکولوں کے اندر یہ صورت حال ہے تو علامہ اقبال کا جو نقطۂ نگاہ پیش کیا آپ اور ہم اس کو کہاں نافذ کریں گے؟ اور صرف ایک پنجاب کالج یا دوسروں کی بات نہیں ہے جتنے بھی اسلامی ذہن کے لوگوں نے سکول، کالج، یونیورسٹیاں کھول رکھی ہیں سارے کے

سارے یہ کام کر رہے ہیں قرار دادیں ہم کچھ اور پاس کرتے ہیں مطالبے حکومت سے کچھ اور کرتے ہیں اور ہم خود کچھ اور کرتے ہیں۔ اس وقت کوئی ایک بھی سکول سسٹم مجھے بتادیں، دعویٰ ان کا کچھ بھی ہوگا سکول کے باہر بورڈ پر لکھا بھی ہوگا کہ ''قرآن اور کمپیوٹر کی تعلیم کے ساتھ ساتھ''، اندر کیا ہو رہا ہے دیکھنا یہ ہے۔ اندر غیر ملکی یونیورسٹیوں کا نصاب پڑھایا جا رہا ہے۔ میں نے آپ سے عرض کیا کہ اس صورت حال میں کیا یہ ممکن ہے؟ میرے خیال میں یہ ممکن نہیں ہے۔

BECAUSE EDUCATIONS HAS BECOME EDUCATIONAL ENTERPRISE OPERATING IN FREE MARKET ECONOMY

یہ ایک کاروبار بن گیا ہے جو آزاد منڈی میں کام کر رہا ہے۔ اب اس کے لیے کوئی تحریر نہیں ہے کوئی اخلاق، کوئی قانون نہیں ہے۔ اور افسوس یہ ہے کہ یہ خریدے اور بیچے جانے والی COMMODITY ہے۔ یہ جو گلوبلائزیشن کی ایک WAVE آئی ہے اس کے اندر ایک سروسز کا اصول ہے کہ بین الاقوامی خدمات کی حیثیت اور کیفیت کیا ہے، اس میں ایجوکیشن کو بھی ایک سروس قرار دیا گیا ہے (THE EDUCATION HAS BECOME A COMMODITY)۔ اس COMODITY کو بیچنا اور خریدنا ہے تو اس میں خرید و فروخت کے سارے ضابطے اور قانون پر عمل درآمد ہوگا.....۔

ایک اور خرابی یہ ہوگئی کہ تعلیم BORDER LESS ہوگئی، تعلیم کی کوئی سرحد نہیں ہے، VIRTUAL EDUCATION کی بارڈر نہیں ہوتی اور اس کے علاوہ بھی اگر ہم دیکھیں کہ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اندر ہم پڑھاتے کیا ہیں؟ سب کچھ وہ پڑھاتے ہیں جو باہر سے آتا ہے، ہمارا اپنا تو کچھ بھی نہیں ہے اور اگر کچھ ہے بھی تو اس سے ہم واقف نہیں ہیں۔ دنیا میں اگر کہیں کام ہو بھی رہا ہے تو اتنا SCATTERED اور پھیلا ہوا ہے اور اتنا گم شدہ ہے کہ کسی کو پتہ ہی نہیں ہے۔ ہم اپنی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں جو پولیٹیکل سائنسز پڑھاتے ہیں، اکانومی پڑھا رہے ہیں، شوشیالوجی پڑھا رہے ہیں وہ ساری کی ساری WESTERN پڑھا رہے ہیں حالانکہ ان کے اپنے مسائل و موضوعات ہیں، ہم اسی کو لے کر پڑھاتے ہیں۔ پچھلے دنوں اسلام آباد کی ایک یونیورسٹی PAKISTAN TUTOR DEVELOPMENT ECONOMICS کے وائس چانسلر سے ملاقات ہوئی وہ بہت نیک اور متشرع آدمی ہیں اور

ویسے بھی بہت پڑھے لکھے ہیں HARDWARD یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے ہیں، وہ کہنے لگے کہ میں کیا کروں، کس کو اسلامائز کروں؟ میرے پاس تو سارے کا سارا لٹریچر ہی WESTERN ہے ان کے مسائل مختلف ہیں میرے مسائل مختلف ہیں میرے مسائل پر لکھی ہوئی کوئی کتاب ہی نہیں ہے۔ لہٰذا یہ جو اسلامائزیشن آف اکنامکس اور اسلامائزیشن آف بینکنگ کا مذاق ہو رہا ہے یہ سارے کا سارا فراڈ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہے۔

اس لیے میں نے عرض کیا کہ جو کچھ میں نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے یہ فی الحال ممکن نہیں ہے اس کے لیے بہت محنت کی ضرورت ہے۔ لیکن کیا کیا جائے؟ آغاز کرنے کے لیے چند باتیں پیش کروں گا۔ چند نکات پیش کرتا ہوں کہ کرنا کیا چاہیے تاکہ کہیں سے کچھ آغاز تو ہو۔

1۔ چھٹی سے بارھویں جماعت تک قرآن کریم ترجمہ کے ساتھ پڑھانے کے لیے حکومت نے قانون بنا دیا ہے۔ صوبہ سرحد کی حکومت میں حکم دے دیا ہے اور FEDERAL حکومت نے باقاعدہ بل بھی پاس کر دیا ہے۔ حکومت اس سے پہلے بھی کوشش کرتی رہی ہے لیکن یہ نہیں ہوا۔ وجہ یہ ہے کہ کوئی HELP نہیں کرتا، حکومت کے پاس اس کے لیے وسائل اور لوگ نہیں ہیں۔ اس لیے میں درخواست کروں گا کہ جتنے بھی دینی ادارے ہیں، تنظیم اسلامی ہو، دعوت اسلامی ہو یا جماعت اسلامی ہو یا تحریک اسلامی ہو مطالبے کرنے اور قراردادیں پاس کرنے کی بجائے وہ حکومت کی معاونت کریں۔ تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَ التَّقْوٰی۔ اچھے کام میں تعاون کرنا چاہیے۔ ایک تو یہ کام ہے جو کرنے کا ہے۔

2۔ تمام سکولوں، تمام کالجوں اور تمام یونیورسٹیز میں اقبال فورم قائم ہونے چاہئیں۔ میں کچھ عرصہ پہلے پنجاب میں ٹیچر ایجوکیشن کے اداروں کا انچارج تھا ہم نے یہ کام کیا تو بڑی حیرانگی ہوئی کہ بچوں میں کتنا شوق ہے۔ ہم نے کالجز کے مقابلے کروائے۔ آخر میں سرگودھا الیمنٹری کالج اور بہاولپور الیمنٹری کالج یہ رہ گئے۔ چار چار کی ٹیم تھی دو گھنٹے تک وہ لگے رہے شعر ختم ہی نہیں ہو رہے تھے۔ اس قدر بچوں نے محنت کی تھی۔ شعر پڑھنے سے، یاد کرنے سے بھی سیرت پر اثر پڑتا ہے۔ لہٰذا تمام تعلیمی اداروں کے اندر اقبال فورم قائم ہونے چاہئیں اور کلام اقبال لحن کے ساتھ اور کلام اقبال تحت اللفظ کے ساتھ پڑھنے کے مقابلے ہونے چاہئیں۔ علامہ اقبال کی نظم

''لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنا میری'' اب بھی بہت سے اداروں میں پڑھی جاتی ہے اسے قانوناً لازم ہونا چاہیے اس کے بڑے گہرے اثرات ہیں۔ میں نے بچوں کو دیکھا ہے خاص طور پر پرائمری اور ہائی سکول کے بچوں کو دیکھا ہے ان کے کردار میں اس کے بہت گہرے اثرات ہیں۔

3۔ تربیت اساتذہ کے تمام پروگراموں میں تعلیم اقبال کا لازمی کورس ہونا چاہیے۔ دکھ کی بات یہ ہے کم از کم پنجاب میں ٹیچر ایجوکیشن پری سروسز کے سارے پروگرامز ختم کر دیے گئے ہیں لیکن بہر حال میں RECOMMEND کروں گا کہ جہاں یونیورسٹیز میں پری سروسز ٹیچر ایجوکیشن کورس ہو رہے ہیں وہاں تعلیماتِ اقبال کا جو لازمی کورس ہے وہ ان تمام اداروں کا حصہ ہونا چاہئے۔

4۔ وزیراعظم پاکستان وسیع پیمانے پر کلیاتِ اقبال تقسیم کریں۔ یہ جو لیپ ٹاپ دے رہے ہیں اس سے تباہی تو ہو ہی رہی ہے تو ساتھ کلیات اقبال بھی دینا شروع کر دیں جو بہت ہی کم قیمت ہوتے ہیں۔

5۔ تمام دینی ادارے علامہ اقبال کے فارسی کلیات لازمی مضمون کے طور پر پڑھائیں۔ اس سے بڑا فرق پڑے گا۔ علمائے کرام کو اردو شعر تو آتے ہیں فارسی سے وہ واقف نہیں ہیں۔

6۔ اردو کے ہر جماعت کے نصاب میں پرائمری، سیکنڈری، کالجوں میں ہر جگہ علامہ اقبال کی نظموں کی ریشو (شرح) کو بڑھایا جائے۔

7۔ اس کے علاوہ منتخب فرمودات قائد، منتخب اشعار اقبال اور قرآنِ مجید کی منتخب آیات اور احادیث تعلیمی اداروں کے اندر بھی اور کلاس روم کے اندر بھی لگائی جائیں۔

کچھ عرصہ پہلے پنجاب یونیورسٹی لاہور میں جنرل ارشد صاحب نے اتنا خوبصورت کام کیا تھا کہ پنجاب یونیورسٹی میں گھومتے پھرتے کئی شعر یاد ہو جاتے تھے، کئی آیتیں یاد ہو جاتی تھیں، کئی حدیثیں یاد ہو جاتی تھیں جو بعد میں آنے والوں نے ختم کر دیا۔ تو یہ بھی ضروری ہے کہ تعلیمی اداروں کے اندر ایسا ہونا چاہیے۔

ریاستِ مکہّ

(سیرتِ امام المرسلین ﷺ)

ساجد محمود مسلم

مکّہ مکرّمہ کرۂ ارض کی اوّلین انسانی بستی تھی، تاہم اوّلین انسانوں کو خوراک کی تلاش کے سلسلہ میں خانہ بدوش بننا پڑا، جس کے باعث وہ مکہ مکرمہ کو مستقل آباد نہ رکھ سکے۔ امتدادِ زمانہ سے مکہ کی واحد عمارت بیت اللہ بھی شکست وریخت کے باعث کھنڈر میں تبدیل ہوگئی تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ کی لکھی ہوئی تقدیر میں مکہ کو قیامت تک آباد رہنا تھا۔ لہٰذا سیّدنا ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی دوبارہ تعمیر کرکے مکہ کی آبادی کی بنیاد رکھ دی تھی۔ سیّدنا اسماعیل علیہ السلام مکہ کی اس بستی کے پہلے حاکم ورئیس تھے۔ انہوں نے مکہ کے اردگرد کے لوگوں کو بیت اللہ کے طواف اور یہاں کی مجاورت کی دعوت دی، جس کی وجہ سے مکہ کی آبادی میں اضافہ ہوتا گیا۔ دین توحید کے اس مرکز سے نورِ توحید کی شعاعیں اطرافِ عالم میں پھیلنے لگیں۔

طویل زمانہ گزرنے کے بعد بنو اسماعیل زمین میں پھیل گئے اور ان کے اس انتشار کے باعث ریاست مکہ بنو جرہم میں منتقل ہوتی رہی۔ مضاض بن عمرو الجرہمی نیک طینت بزرگ تھے، مگر ان کی بعد کی نسلیں دین حق سے برگشتہ ہوگئیں، انھوں نے بیت اللہ کی حرمت کو پامال کیا، اپنے قبیلے کے سوا وہ کسی کا وجود مکہ میں برداشت نہ کرتے تھے، لہٰذا بیت اللہ کا حج کرنے کے لئے آنے والوں پر وہ بہت ظلم ڈھاتے، حتیٰ کہ بیت اللہ کے خزانے پر بھی ہاتھ صاف کرنے لگے۔ جب بنو بکر اور بنو خزاعہ نے یہ ظلم وستم دیکھا تو ان سے رہا نہ گیا، چنانچہ انھوں نے بنو جرہم کے ساتھ فیصلہ

کن جنگ کی جس میں بنوجرہم کوشکست ہوئی۔ بنوجرہم نے مکہ سے جاتے وقت زمزم کا کنواں مٹی سے پاٹ دیا، جس کی وجہ سے لوگ اس کے پاک پانی سے محروم ہوگئے۔

بنوجرہم نے بیت اللہ کا سارا خزانہ چوری کرنے کی کوشش کی تو اللہ تعالیٰ نے اس خزانے پر ایک خوفناک شیش ناگ مسلط کردیا جس کی پشت سیاہ اور پیٹ سفید تھا۔ بنوجرہم کے بعد بنوخزاعہ مکہ کے رئیس بن گئے اور کعبہ کی تولیت بھی ان کے ہاتھ آ گئی، جو نسل در نسل انہی میں منتقل ہوتی رہی۔ (سیرت ابن ہشام مع الروض الانف، ج ا، ص ۲۴۱۔۲۴۲)

ریاستِ مکہ کا انتظام وانصرام

سابقہ باب 'آلِ اسماعیل' میں بیان کیا جاچکا ہے کہ قصیّ بن کلاب نے منتشر قریش کو مکہ میں جمع کیا اور یہاں بیت اللہ کے اردگرد ان کی مستقل بستی بسائی۔ قصی کے زمانہ سے ریاستِ مکہ کے حاکم ورئیس قریش تھے۔ مکہ کے تمام اہم عہدوں پر قرشی سردار ہی فائز تھے۔ قصیّ کے بعد مکہ کے تمام انتظامی معاملات اس کی اولاد میں تقسیم ہوگئے تھے۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ آیا قصی نے خود تمام عہدے اپنے دونوں بیٹوں عبدمناف اور عبدالدار میں تقسیم کیے تھے یا اپنے بڑے بیٹے عبدالدار کو ہی تمام عہدے سونپ دیے تھے اور بعد میں بنوعبدمناف نے طاقت کے بل پر اپنا حصہ وراثت وصول کیا تھا۔ معاملہ جو بھی ہو یہ بات متفقہ طور پر ثابت ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی ولادت کے وقت یہ عہدے بنوعبدمناف اور بنوعبدالدار نے آپس میں بانٹ لیے تھے۔ یہ تقسیم حسب ذیل ہے:

بنوعبدمناف کے عہدے: الرفادہ (کھانے کا انتظام) اور السقایہ (پانی کا انتظام) کے محکمے ہاشم بن عبدمناف اور ان کے بعد عبدالمطلب بن عبدمناف کو وراثت میں مل گئے۔ جبکہ القیادہ (سپہ سالاری) کا محکمہ عبدمناف کے بیٹے عبدشمس کو وراثتاً ملا، بعد میں یہ نسل در نسل چلتا ہوا امیہ بن عبدشمس، پھر حرب بن امیہ اور بالآخر ابوسفیان بن حرب کو مل گیا۔

بنوعبدالدار کے عہدے: الحجابہ (بیت اللہ کے خزانے کی نگرانی) کا محکمہ عبدالدار کے بیٹے عثمان کو ملا جو نسل در نسل اس کی اولاد میں منتقل ہوتا رہا، جب کہ دارلندوہ (پارلیمنٹ ہاؤس) پہلے عبدالدار کے بیٹے عبدمناف کو ملا مگر پھر عثمان بن عبدمناف کے بیٹے عبدالعزیٰ کو یہ مکان ملا اور

اسی کی نسل میں منتقل ہوتا رہا۔(السیرۃ الحلبیہ، ج۱،ص۲۱تا۲۵)

مکہ: ایک مذہبی مرکز

مکہ مکرمہ ایک سنگلاخ وادی ہے جسے چاروں اطراف سے اونچے نیچے پہاڑوں نے گھیر رکھا ہے۔اس وادی کے وسط میں ایک مکعب نماCUBOID شکل کی عمارت ایستادہ ہے جسے کعبہ یا بیت اللہ کہا جاتا ہے۔ یہ عمارت دراصل ایک کمرہ پر مشتمل ہے،جس کا صرف ایک دروازہ ہے اور اس میں کوئی روشن دان یا کھڑکی نہیں ہے۔ جزیرۃ العرب پر مبعوث ہونے والے تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کی اُمتیں اس بیت اللہ کی تعظیم وتکریم کرتی آئی ہیں۔سیدنا آدم علیہ السلام کے زمانہ سے بیت اللہ تمام انسانوں کا قبلہ چلا آرہا ہے،جس کی طرف منہ کرکے لوگ مخصوص مراسمِ عبادت بجالاتے رہے ہیں۔ بیت اللہ صرف اہلِ مکہ کی عبادت گاہ نہیں تھا بلکہ تمام اہلِ عرب اس کی تعظیم کرتے تھے۔ بیت اللہ کی اس تعظیم اور اس کی مجاورت کے سبب قریش کو وسطِ عرب میں بالعموم اور حجاز میں بالخصوص بلند مقام حاصل تھا۔ وسطِ عرب کے اکثر قبائل ریاستِ مکہ کے مطیع وفرمانبردار تھے۔قریش کے حلیف (دوست) بننا عرب قبائل کے نزدیک باعث اعزاز تھا۔ بیت اللہ کی تولیت کے سبب قریش کو اہل اللہ کا لقب دیا گیا تھا۔شمال وجنوب کے عرب بادشاہ تک قریش کی تعظیم کرتے تھے۔(فخرالدین الرازیؒ،مفاتیح الغیب، ج۳۲،ص۱۰۴)

بنوعدنان، بالخصوص قریش کا یہ زَعم تھا کہ وہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے لائے ہوئے دین کے سچے پیروکار ہیں۔اہلِ عرب ہر سال ذوالحج کے مہینے میں بیت اللہ کا حج کرنے کے لئے مکہ میں جمع ہوتے تھے۔ غالب گمان یہی ہے کہ اُس زمانہ میں بھی یہ جزیرۃ العرب کا سب سے بڑا اجتماع ہوتا تھا،جس کے عربوں بالخصوص ریاستِ مکہ کی معیشت،تجارت،ثقافت،ادب اور رسوم ورواج پر بڑے گہرے اثرات مرتب ہوتے تھے۔

مکہ: ایک تجارتی مرکز

جزیرۃ العرب کے محل وقوع نے اسے ایک اہم تجارتی شاہراہ بنادیا تھا۔ چین، ہندوستان اور مشرقِ بعید سے بحری جہازوں میں سامان تجارت لادکر بحرِ ہند کے راستے لایا جاتا جو

یمن کی بندرگاہ عدن پر لا کر اتارا جاتا، پھر گھوڑوں، خچروں، اونٹوں وغیرہ پر لاد کر سارا جزیرۃ العرب پار کر کے شمال میں واقع رومی سلطنت، دیگر یورپی ممالک اور مصر وغیرہ میں لے جایا جاتا۔ اسی طرح روم سے سامانِ تجارت لایا جاتا اور عدن کی بندرگاہ سے بحری جہازوں پر لاد کر ہندوستان اور مشرقِ بعید کے ممالک تک پہنچایا جاتا تھا۔ یہ تجارتی شاہراہ بحرقلزم (بحراحمر) کے مشرقی ساحل کے ساتھ شمالاً جنوباً واقع تھی۔ اس تجارتی شاہراہ کو عالمی تجارتی شاہراہ (WORLD TRADE ROOT) ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ مکہ مکرمہ بحرقلزم سے صرف پچاس میل کے فاصلے پر واقع ہے لہٰذا حج کے مہینوں میں تجارتی قافلے مکہ مکرمہ کا رخ کرتے تھے، یوں عالمی تجارتی شاہراہ پر واقع ہونے کی وجہ سے یہ ایک اہم تجارتی مرکز بن گیا تھا۔

یورپ کا زیادہ حصہ منطقہ باردہ (Frigid Zone) میں شامل ہونے کی وجہ سے یہاں کی آب و ہوا شدید سرد ہے، لہٰذا یورپی اقوام کے لئے گرم مسالا جات کی افادیت محض لذت آفرینی تک محدود نہیں، بلکہ وہ اس سے بھی بڑھ کر اس کی ضرورت محسوس کرتی ہیں۔ گرم مسالا جات کی زیادہ تر منڈیاں مشرقِ بعید اور ہندوستان میں پائی جاتی تھیں۔ لہٰذا روم اور دیگر یورپی منڈیوں تک گرم مسالا جات کی ترسیل جزیرۃ العرب کے راستے ہوتی تھی، یوں اسے اس عالمی تجارتی شاہراہ کا ایک حصہ ہونے کا اعزاز حاصل تھا جسے شاہراہِ مسالا جات (SPICE ROUTE) کہا جاتا ہے۔

وکی پیڈیا میں اس تاریخی واقعے کو یوں بیان کیا گیا ہے:

> In the second half of the first millennium BC the Arab tribes of South and West Arabia took control over the land trade of spices from South Arabia to the Mediterranean Sea. (Wikipedia:Spice Trade)

''تقویم قبل مسیح کے پہلے ہزاریے کے نصف ثانی میں (آج سے تقریباً اڑھائی ہزار سال پہلے) جنوبی و مغربی عرب کے عرب قبائل نے جنوبی عرب (یمن) سے بحر روم تک خشکی کے راستے ہونے والی گرم مسالا جات کی تجارت پر تسلط جما لیا تھا۔''

عرب و روم کے درمیان گرم مسالا جات کے علاوہ سونا، چاندی، جواہرات، ریشم و

اطلس، زعفران نیز سواری اور جنگ کے لئے استعمال ہونے والے جانوروں بالخصوص ہاتھی اور گھوڑوں وغیرہ کی تجارت بھی کثرت سے ہوتی تھی۔

پہلی صدی عیسوی کا مشہور رومی مؤرخ بلینوس اسکندوس (۲۳ تا ۷۹ عیسوی) اپنی کتاب Historia Naturae میں اس زرِمبادلہ کا ذکر حسرت سے کرتا ہے جو چینی، ہندی اور عرب تاجر ہر سال روم سے کما کر لے جاتے تھے:

> India, China and the Arabian peninsula take one hundred million sesterces from our empire per annum at a conservative estimate: that is what our luxuries and women cost us. (Wikipedia: Indo-Roman trade relations)
>
> ''ایک محتاط اندازے کے مطابق ہندوستان، چین اور جزیرۃ العرب (کے سوداگر) ہماری (رومی) سلطنت سے سالانہ دس کروڑ نقرئی سکے کما کر لے جاتے ہیں۔ یہ وہ قیمت ہے جو ہمیں اپنی آسائشوں اور خواتین کے لئے چکانا پڑتی ہے۔''

مکہ مکرمہ کے اکثر باشندے قبیلہ قریش سے تعلق رکھتے تھے۔ قریش تجارت پیشہ تھے اور جزیرۃ العرب کی تجارت پر گویا انہوں نے اپنی ایک اجارہ داری قائم کر رکھی تھی۔ خصوصاً ہاشم بن عبد مناف نے اس تجارتی سرگرمی کو دوچند کر دیا تھا۔ جناب ہاشم سے پہلے سال میں ایک بار کوئی تجارتی قافلہ مکہ سے روانہ ہوتا تھا، مگر انہوں نے سال میں دو قافلے روانہ کرنے کا رواج ڈالا۔ شام چونکہ یورپ کے قریب واقع تھا اس لئے یورپ سے آنے والی سرد ہواؤں کے سبب یہاں کا موسم سردیوں میں شدید سرد ہو جاتا تھا، اس پر مستزاد یہ کہ یہاں بارشیں بھی موسم سرما میں ہی ہوتی تھیں، آج بھی یہاں سرد راتوں میں درجۂ حرارت منفی سولہ درجے تک گر جاتا ہے۔ ایسے میں تجارتی قافلے کے لئے سردی اور بارش کے باعث کھلے آسمان تلے راتیں گزارنا نہایت مشکل تھا۔ لہٰذا قریش موسم گرما میں شام اور موسم سرما میں یمن کا سفر کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ (زادالمسیر، ج۹، ص۲۴۱)

قریش کی عرب تجارت پر اجارہ داری کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ہاشم بن عبد مناف نے قیصرِ روم سے باقاعدہ مراسم بنا رکھے تھے اور قریش کے لئے خصوصی

راہداری حاصل کر لی تھی۔

رئیسِ مکہ عبدالمطّلب الفیّاض

ہاشم بن عبد مناف کے بعد بیت اللہ کی تولیت، سقایہ اور رفادہ عبدالمطّلب بن ہاشم کو وراثتاً مل گئے تھے، جس کی وجہ سے مکہ ہی میں نہیں، تمام جزیرۃ العرب میں آپ کو بلند مقام حاصل تھا۔ جناب عبدالمطّلب دین حنیف پر قائم تھے۔ وہ اللہ کی وحدانیت اور آخرت پر ایمان رکھتے تھے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب ظالموں کو ان کے ظلم کی سزا ملے گی۔ عبدالمطّلب مستجاب الدعوات تھے اور اپنی سخاوت کے سبب قریش میں الفیاض کے نام سے مشہور تھے۔ آپ نے شراب پینا اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ آپ دسترخوان سے پرندوں کے لیے بچا لیتے اور پہاڑوں پر پھینک آتے۔ (السیرۃ الحلبیہ، ج ا، ص ۹۔۱۱)

زمزم کی دریافت

عبدالمطلب کے کندھے پر چونکہ حاجیوں کو پانی پلانے کی ذمہ داری پڑی ہوئی تھی، جس کے لئے انہیں مکہ کے قریب واقع تالابوں سے پانی مشکیزوں میں بھر بھر کے لانا پڑتا تھا جو نہایت مشقت طلب کام تھا۔ سابقہ باب میں مذکور ہوا کہ بنو جرہم نے مکہ المکرّمہ سے خروج کے وقت زمزم کا کنواں مٹی سے پاٹ دیا تھا، مدتِ دراز گزرنے کی وجہ سے اس کا نشان تک مٹ گیا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ زمزم کا کنواں کہاں تھا؟ عبدالمطلب کی شدید خواہش تھی کہ کسی طرح زمزم کا سراغ مل جائے تاکہ لوگ اس کے مقدس پانی سے خود کو سیراب کر سکیں، یوں ان کی اپنی مشقت میں بھی خاطر خواہ کمی واقع ہو جائے گی۔ آخر ان کی مراد بر آئی۔

ہوا یوں کہ انھوں نے ایک نیک خواب دیکھا۔ چار روز تک انھیں زمزم کے مختلف نام لے کر زمزم کا کنواں کھودنے کی ہدایت کی گئی۔ چوتھے دن خواب میں زمزم کے کنویں کی نشاندہی بھی کر دی گئی۔ اس وقت تک عبدالمطّلب کے ہاں ایک ہی بیٹا حارث پیدا ہوا تھا۔ آپ اسے ساتھ لے کر اس مقام پر پہنچے جس کا اشارہ انھیں خواب میں دیا گیا تھا۔ وہاں آپ نے اپنے بیٹے کے ساتھ مل کر زمین کھودنا شروع کر دی۔ قریش کا کوئی اور شخص اس مشقت میں آپ کے ساتھ

شریک نہ تھا۔ جب کھدائی اس مقام تک پہنچی جہاں عموماً پانی نکل آتا تھا تو عبدالمطلب نے بآوازِ بلند اللہ اکبر کہا۔ ان کی تکبیر سن کر قریش سمجھ گئے کہ عبدالمطلب اپنی مراد کو پہنچ گئے ہیں۔

قریش عبدالمطلب کے پاس آئے اور کہنے لگے: ''اے عبدالمطلب یقیناً یہ کنواں ہمارے باپ سیّدنا اسماعیل علیہ السلام کا ہے، لہٰذا اس میں ہمارا بھی حق ہے، پس آپ ہمیں بھی اس میں اپنے ساتھ شریک بنائیں''۔ عبدالمطّلب کہنے لگے: ''میں ایسا کرنے والا نہیں، بے شک مجھے اس کنویں کے لیے خاص طور پر چنا گیا ہے اور یہ تمہاری موجودگی میں عطا کیا گیا ہے''۔ وہ کہنے لگے: ''ہمارے ساتھ انصاف کیجیے، ہم آپ کو چھوڑنے والے نہیں جب تک کہ ہم آپ سے اس کے بارے میں جھگڑ نہ لیں''۔ عبدالمطّلب نے کہا: ''تم اپنے اور میرے بیچ کسی کو ثالث بنالو جس کو تم لوگ چاہو''۔

ملک شام کی ایک کاہنہ پر فریقین کا اتفاق ہوگیا جو بنی سعد ہذیم سے تعلق رکھتی تھی۔ قریش کے ہر قبیلے میں سے ایک ایک گروہ شام جانے کے لیے تیار ہوگیا، اسی طرح جناب عبدالمطّلب نے بھی بنوہاشم کا گروہ ساتھ لیا اور یہ سب لوگ شام کے لیے روانہ ہوگئے۔ یہ لوگ ابھی حجاز اور شام کے درمیانی راستے پر تھے کہ عبدالمطّلب اور ان کے ساتھیوں کے مشکیزوں میں پانی ختم ہوگیا۔ انھوں نے دوسرے قبائل سے پانی مانگا مگر انھوں نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ تب عبدالمطّلب نے اپنے قبیلہ والوں سے کہا کہ تم سب اپنی اپنی قبر کھودلو اور اپنی موت کا انتظار کرو، انھوں نے ایسا ہی کیا اور اپنی قبروں کے کنارے بیٹھے شدتِ پیاس سے موت کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد عبدالمطّلب نے کہا: ''ہم نے اپنی موت کا سامان خود ہی کر دیا ہے، ہم نے زمین میں گھوم پھر کر پانی کی تلاش تو کی نہیں، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں کسی مقام پر پانی مہیا کردے''۔ پس وہ سب اپنی سواریوں پر سوار ہونے لگے اور پانی کی تلاش کے لیے چلنے لگے تھے کہ جب عبدالمطّلب کی سواری آگے بڑھی تو اس کے قدم کے نیچے سے شیریں پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا۔ تب عبدالمطّلب نے اللہ اکبر کہا اور آپ کے ساتھیوں نے بھی تکبیر کہی۔ پس وہ سواری سے اتر آئے، خوب سیر ہوکر پانی پیا اور انھوں نے اپنے مشکیزے بھی بھر لیے۔ شاید یہ مایوسی ترک کرنے پر اللہ کی طرف سے خصوصی انعام تھا۔ انھوں نے دوسرے قرشی قبائل کو بھی آواز دی کہ آؤ یہاں

پانی ہے، ہمیں اللہ تعالیٰ نے پانی عطا کر دیا ہے۔ سب قبائل وہاں اکٹھے ہو گئے، پھر انھوں نے بھی پانی پیا اور اپنے مشکیزے بھر لیے۔ اللہ تعالیٰ کے اس خصوصی انعام کو دیکھ کر یہ قبائل کہنے لگے: ''اے عبدالمطلب! اللہ تعالیٰ نے ہمارے اور آپ کے درمیان فیصلہ کر دیا۔ واللہ ہم زمزم کے لیے کبھی آپ کے ساتھ جھگڑا نہ کریں گے۔ بے شک جس ربّ نے آپ کو اس بے آب و گیاہ سرزمین میں پانی سے نوازا ہے، اسی نے آپ کو زمزم عطا کیا ہے۔ پس آپ اپنے پانی پلانے کے عہدے کی جانب بامراد ہو کر لوٹیے''۔ غرض کاہنہ کے پاس جانے کی نوبت ہی نہ آئی اور بنو ہاشم کا دیگر قریش کے ساتھ زمزم کا تنازع رفع ہو گیا۔ (سیرت ابن ہشام مع الروض الانف، ج ۱، ص ۲۸۶۔۲۹۳)

عبدالمُطّلب کی عجیب نذر

جناب عبدالمطّلب کو زمزم کے معاملے میں قریش کے ابتدائی رویے سے سخت قلق ہوا۔ چنانچہ انھوں نے اس موقع پر اللہ تعالیٰ سے نذر مانی کہ اگر ان کے ہاں دس بیٹے پیدا ہوئے تو وہ ان میں سے ایک کو اللہ کے نام پر قربان کر دیں گے۔ جب اللہ تعالیٰ نے انھیں دس بیٹے عنایت کر دیے اور وہ سب جوان ہو گئے تو ایک روز انھوں نے اپنے سب بیٹوں کو بلا بھیجا۔ سب جمع ہو گئے تو آپ نے انھیں اپنی مانی ہوئی نذر کے بارے میں بتایا۔ ان سب نے سرِتسلیم خم کر دیا اور کہا جیسا آپ چاہیں ویسا کریں۔ تب سب بیٹوں کے نام قرعہ ڈالا گیا۔ قرعہ اندازی میں جناب عبداللہ کا نام نکلا جو کہ اس وقت اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ عبدالمطّلب نے اپنے سب سے پیارے بیٹے کو قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اسے بیت اللہ کے ساتھ بنی ہوئی قربان گاہ پر لٹا کر ذبح کرنے ہی والے تھے کہ قریش نے انھیں ایسا کرنے سے زبردستی روک دیا کہ اگر عبداللہ ذبح ہو گئے تو پھر قریش میں لڑکوں کو ذبح کرنے کی رسم پڑ جائے گی۔ طے یہ ہوا کہ اس نذر کے بارے میں حجاز کی مشہور کاہنہ سے رائے لی جائے۔ وہ کاہنہ یثرب (مدینہ منورہ) میں رہائش پذیر تھی۔ اس کے پاس پہنچے اور اسے ساری صورتحال کے بارے میں آگاہ کیا گیا۔ اس نے کہا کہ آج تم واپس چلے جاؤ اور کل میرے پاس آنا۔ پس وہ واپس لوٹ گئے۔ اس دوران عبدالمطلب اللہ تعالیٰ سے خیر طلب کرتے رہے۔ اگلے روز وہ کاہنہ کے پاس پہنچے تو اس نے کہا کہ ''مجھے معاملے کا حل پتہ چل گیا ہے۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے ہاں دِیت (خون بہا) کی مقدار کیا رائج ہے؟''

بتایا گیا کہ دس اونٹ۔ کاہنہ نے کہا: ''اب تم لوٹ جاؤ اور عبداللہ اور دس اونٹوں کا قرعہ ڈالو، اگر پھر بھی تمہارے بیٹے کا نام نکلے تو دس اونٹ بڑھا کر پھر قرعہ ڈالو، اگر پھر تمہارے بیٹے کا نام نکلے تو دس اونٹ اور بڑھا دو۔ اسی طرح ہر بار دس اونٹ بڑھاتے جاؤ یہاں تک کہ قرعہ اونٹوں کے نام نکل آئے''۔ یہ تجویز سب کو پسند آئی، مکہ لوٹنے پر اس تجویز پر بعینہٖ عمل کیا گیا۔ پہلی بار عبداللہ اور دس اونٹوں کے نام قرعہ ڈالا گیا تو قرعہ عبداللہ کے نام نکلا، اگلی بار دس اونٹ بڑھا کر عبداللہ اور بیس اونٹوں کے نام قرعہ ڈالا گیا، اس بار بھی عبداللہ کے نام قرعہ نکلا۔ دس اونٹ مزید بڑھا دیے گئے، پھر عبداللہ کا نام نکلا، ہر بار دس دس اونٹ بڑھائے جاتے رہے یہاں تک کہ جب عبداللہ اور سو اونٹوں کے نام قرعہ ڈالا گیا تو قرعہ اونٹوں کے نام نکل آیا، سب کے چہرے کھل اُٹھے۔ عبدالمطّلب سب سے زیادہ مسرور تھے۔ جناب عبداللہ کی بجائے سو اونٹ اللہ کے نام پر ذبح کیے گئے اور آئندہ قریش میں یہی دِیَت کی مقدار مقرر کر دی گئی۔

اصحابِ فیل

جن دنوں جناب عبدالمطّلب مکہ کے رئیس اور بیت اللہ کے متولی بنے تھے، انہی دنوں یمن، حبشہ کے نصرانیوں کے زیرِتسلط آ چکا تھا۔ اس وقت حبشہ کے بادشاہ کا لقب مقامی زبان میں نجاشی تھا۔ نجاشیٔ وقت کی جانب سے ابتداءً ارياط نامی شخص یمن کا حکمران مقرر ہوا۔ ارياط کا ایک صاحبِ اثر و رسوخ حبشی سالار اَبرہہ سے تنازعہ ہو گیا، دونوں اپنے اپنے حمایتیوں کو میدان میں لے آئے، ارياط نے ابرہہ سے کھلی جنگ سے پہلے دُو بدو مقابلہ کا فیصلہ کیا۔ ارياط، ابرہہ کے ایک غلام کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے قتل کے بعد ابرہہ تخت نشین ہوا۔ ابرہہ کی اس جسارت پر نجاشی سخت غضبناک ہوا، اس نے ابرہہ کو نیست و نابود کرنے کی ٹھان لی، جس پر ابرہہ نے چاپلوسی اور خوشامد کی حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے نجاشی کا دم بھرنے کا عہد کیا، نیز اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایک نہایت عالیشان گرجا یمن کے پایۂ تخت صنعا میں تعمیر کرایا۔ اس نے نجاشی کو پیغام بھیجا کہ ''میں نے آپ کی جانب سے بے مثال گرجا تعمیر کرایا ہے، اس جیسا گرجا آپ سے پہلے کسی بادشاہ نے تعمیر نہیں کرایا۔ میرا ارادہ ہے کہ عرب کے لوگوں کا رُخ بیت اللہ سے پھیر کر اس گرجا کی طرف کر دوں تاکہ لوگ مکہ کی بجائے اس گرجا کا حج (زیارت) کرنے آیا کریں''۔

ابرہہ کے اس ناپاک ارادہ کی خبر جنگل میں آگ کی طرح سارے عرب میں پھیل گئی، بیت اللہ تمام عربوں کے نزدیک نہایت محترم ومقدس مقام چلا آتا تھا، لہٰذا عربوں میں ابرہہ کے خلاف غصہ ونفرت کی شدید لہر پیدا ہوگئی۔ قبیلہ فقیم کے ایک جوشیلے نوجوان نے اس غصہ ونفرت کا اظہار اس طرح کیا کہ ابرہہ کے گرجا میں پاخانہ کردیا۔ ابرہہ کو بتایا گیا کہ بیت اللہ کے ایک معتقد نے اس کے گرجا کو ناپاک کرکے اس کی شدید توہین کی ہے۔ ابرہہ یہ سن کر آگ بگولا ہوگیا چنانچہ اس نے قسم کھائی کہ وہ بیت اللہ کو منہدم کرکے دم لے گا۔ اس نے ایک بڑا لشکر تیار کیا اور بیت اللہ کو منہدم کرنے کی غرض سے مکہ کی جانب گامزن ہوا۔

جب اہل عرب کو ابرہہ کے اس ناپاک ارادے کی خبر ملی تو وہ غیض وغضب سے بھر گئے، مگر ابرہہ کے منظّم لشکر کے مقابلے کی سکت منتشر قبائل میں نہ تھی۔ تاہم جوشیلے جانبازوں کے ایک گروہ نے ذونفر کی قیادت میں اس لشکر پر ہلّہ بولا مگر اس جوشیلے گروہ کو شکست ہوئی اور اسے قیدی بنالیا گیا۔ لشکر آگے بڑھا تو نفیل بن حبیب کی قیادت میں دو قبیلوں کے نوجوانوں نے اس پر حملہ کیا مگر انھیں بھی شکست ہوئی اور انھیں بھی قید کرلیا گیا۔ نفیل بن حبیب کی جان بخشی اس شرط پر ہوئی کہ وہ انھیں مکہ کی طرف رہنمائی کرے گا اور لشکر کو ادھر ادھر بھٹکنے سے بچائے گا۔

ابرہہ کا لشکر پیش قدمی کرتا ہوا مکہ کے قریب واقع قصبہ طائف کے مضافات میں جا پہنچا اور اس لشکر نے یہاں پڑاؤ ڈال لیا تو اہل طائف نے اپنے بت خانے لات کو تباہی سے بچانے کے لیے ابرہہ کی اطاعت کا اقرار کرلیا اور ابورغال نامی شخص کو ابرہہ کے ساتھ کردیا تاکہ وہ مکہ میں بیت اللہ کی نشاندہی کرسکے جب یہ لشکر مکہ کے نواح میں واقع بستی مغمس کے قریب پہنچا تو ابورغال مرگیا۔ اسے وہیں دفن کردیا گیا۔ لشکر نے مغمس میں ہی پڑاؤ ڈال دیا۔ ابرہہ نے گھڑسواروں کا ایک چھاپہ مار گروہ مکہ بھیجا تاکہ اہل مکہ پر اس کی ہیبت طاری ہوجائے۔ یہ چھاپہ مار گروہ اہل مکہ کا بہت سا مال اسباب چھین لایا، جس میں جناب عبدالمطلب بن ہاشم کے دو سو اونٹ بھی شامل تھے۔ مکہ کے بعض سرکردہ قبائل نے پہلے تو ابرہہ کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا مگر اپنی نفری اور قوت کی قلّت کے باعث انھوں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

ابرہہ نے حناطہ یعمر حمیری کو سفیر بنا کر مکہ بھیجا کہ وہاں کے رئیس و حاکم سے عدمِ

مزاحمت کی بات کرے اور اسے یقین دلائے کہ اس کا مقصد محض کعبہ کو گرانا ہے خونریزی کرنا نہیں۔ سفیر نے مکہ پہنچ کر رئیس مکہ عبدالمطلب بن ہاشم سے گفتگو کی اور انھیں عدم مزاحمت پر راضی کرلیا۔ پھر انھیں ساتھ لے کر ابرہہ کے پاس چلا، عبدالمطلب کے بعض بیٹے بھی ان کے ہمراہ تھے۔ ابرہہ خود ایک پستہ قد شخص تھا جبکہ عبدالمطلب نہایت وجیہ، بلند قامت اور سڈول جسم کے مالک تھے، پھر ان کے ماتھے پر محمد رسول اللہ ﷺ کے جدامجد ہونے کے ناطے خاص قسم کا نور چمکتا تھا۔ چنانچہ جب وہ ابرہہ کے پاس پہنچے تو وہ ان کی وجاہت سے بہت مرعوب ہوا اور تخت سے اُتر کر قالین پر ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ترجمان کے ذریعے ان میں گفتگو ہوئی۔ عبدالمطلب نے سب سے پہلے اپنے دوسو اونٹ واپس کیے جانے کا مطالبہ کیا۔ ابرہہ نے حیرت سے پوچھا: ''تم صرف اونٹوں کا مطالبہ کرنے آئے ہو اس مقدس گھر کے بارے میں تم نے کوئی مطالبہ نہیں کیا''۔ عبدالمطلب نے جواباً کہا: ''میں تو صرف اونٹوں کا مالک ہوں اس لیے ان کی واپسی کا مطالبہ کر رہا ہوں، رہا بیت اللہ تو اس کا مالک اللہ ہے، وہ خود اس کی حفاظت کرے گا''۔ ابرہہ نے ان کے اونٹ واپس کرنے کا حکم دیا اور وہ انھیں لے کر مکہ واپس تشریف لے آئے۔ وہاں پہنچ کر آپ نے قبائل کے سرداروں کو مشورہ دیا کہ ابرہہ کے لشکر کا مقابلہ کرنے کی بجائے پہاڑوں کے غاروں اور گھاٹیوں میں جا چھپنا بہتر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ انھیں ضرور نیست و نابود کردے گا۔ چنانچہ اہل مکہ پہاڑوں پر چڑھ گئے اور غاروں میں چھپ گئے۔

جناب عبدالمطلب پہاڑ پر جانے سے پہلے بیت اللہ شریف کے پاس تشریف لے گئے اور کعبہ کے دروازے کو پکڑ کر یہ دعا کرنے لگے: ''اے پروردگار! ان لشکروں کے مقابلے میں مجھے تیرے سوا کسی سے اُمید نہیں، اے میرے ربّ! ان ظالموں سے اپنے حرمِ محترم کو بچالے، یقیناً اس گھر کا دشمن اصلاً تیرا دشمن ہے، انھیں اپنے گھر کے گرانے سے باز رکھ، اے اللہ! ہر آدمی اپنے مسکن اور منزل کی حفاظت کرتا ہے، تو بھی اپنے گھر کی حفاظت کر، ان کی صلیب اور تدبیر تیری تدبیر پر غالب نہ آنے پائے۔ انھوں نے اپنے لشکروں، شہروں اور ہاتھیوں کو لاکر جمع کیا ہے تاکہ تیرے عیال کو قیدی بنالے جائیں، اے اللہ! اگر تو ان کو ہمارے کعبہ و قبلہ کو گرانے کے لیے چھوڑ دے تو جیسے تیری مرضی، ہماری عرض یہی ہے کہ صلیب کے پجاریوں کے مقابلے میں اپنے

ماننے والوں کی مدد فرما''۔

عبدالمطلب اور آپ کے ساتھی یہ دعا کرنے کے بعد پہاڑوں کی غاروں میں جا چھپے۔ وہ منتظر تھے کہ دیکھیں ابرہہ کے لشکر کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ لشکر میں بہت سے ہاتھی بھی شامل تھے۔ جن میں سب سے قوی الہیکل ہاتھی کا نام محمود رکھا ہوا تھا۔ جب لشکر مکہ میں داخل ہونے کے لیے اس کے قریب پہنچا تو محمود نامی ہاتھی جس طرف سے آیا تھا ادھر کو اُلٹا دوڑ پڑا۔ لوگ اسے پکڑ کر اس کا رُخ مکہ کی طرف کرتے مگر وہ ادھر سے منہ پھیر لیتا۔ وہ اس کا رُخ کسی دوسری طرف کرتے تو وہ اُدھر رُخ کر لیتا مگر مکہ کی جانب رُخ نہ کرتا۔ اسی اثنا میں اللہ تعالیٰ نے بحر احمر کی جانب سے خاص قسم کے پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ اس کثرت سے بھیجے کہ آسمان چھپ گیا۔ ان میں سے ہر پرندے کے پاس تین کنکریاں تھیں، ایک چونچ میں اور دو پنجوں میں۔ پرندے اوپر سے یہ کنکریاں ابرہہ کے لشکر پر پھینکتے، جس کو وہ کنکری لگتی، وہ وہیں ہلاک ہو جاتا۔ لوگ وہاں سے اُلٹے پاؤں بھاگے۔ مگر کنکریاں ان کو لگتی جاتیں اور وہ گر کے تڑپنے لگتے۔ اس اثنا میں ایک کنکر ابرہہ کو بھی لگ گیا، وہ بھی یمن کی طرف بھاگا۔ اس کے پورے بدن پر پھوڑے نکل آئے، جب وہ پھوٹتے تو ان میں سے غلیظ مواد اور خون بہنے لگتا۔ اسی حال میں وہ صنعا پہنچا۔ وہ پرندے کے بچے کی طرح تڑپ رہا تھا یہاں تک کہ جہنم واصل ہوا۔ عربوں کے لیے اصحاب الفیل کا مذکورہ واقعہ اس قدر اہم تھا کہ آئندہ سالوں میں وہ وقت کا تعین عام الفیل (ہاتھیوں والا سال) کی نسبت سے کرنے لگے۔ (سیرت ابن ہشام مع الروض الانف، ج ۱،ص ۱۲۰۔۱۴۵)

واقعہ اصحابِ فیل کا اصل پس منظر:

اہل تحقیق کا ماننا یہ ہے کہ اصحابِ فیل بظاہر عیسائیت کے پیروکار تھے مگر اس عظیم حادثہ کے تانے بانے دراصل یہودیت سے جا ملتے ہیں۔ سیّدنا عیسیٰ علیہ السلام سے چند سو سال پہلے یمن کا مشہور بادشاہ ابو کرب تبّان اسعد بت پرست تھا، پھر یثرب کے راہبوں کے ہاتھوں پر اس نے یہودی مذہب اختیار کر لیا۔ ابو کرب نے اہلِ یمن کو بھی اپنا مذہب تبدیل کرنے کی دعوت دی، جو معمولی مزاحمت کے بعد قبول کر لی گئی، یوں زمانہ قبل از مسیح سے یہودی یمن میں اثر و رسوخ حاصل کر چکے تھے۔ (عبدالرحمٰن السہیلیؒ، الروح الانف مع سیرت ابن ہشام، ج ۱،ص ۷۵)

قرآن کے مطابق یہودیوں کا سب سے بڑا جرم انبیا علیہم السلام کا قتل ہے، ہر زمانہ میں یہودیوں میں ایک خفیہ عنصر ایسا رہا ہے جو اس جرم عظیم میں مبتلا ہوا۔ یثرب اور یمن کے یہودیوں میں بھی یہ عنصر یقینی طور پر موجود تھا، جس کی ٹھوس دلیل یہ ہے کہ یثرب کے یہودیوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا نہ صرف ناپاک منصوبہ بنایا بلکہ اپنے تئیں اس پر عمل بھی کر ڈالا۔ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوکے سے زہر آلود کھانا کھلایا، جس کے پہلے نوالے سے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر کا پتہ چل گیا اور آپ نے اپنے ساتھ مدعو صحابہ کرامؓ کو کھانا کھانے سے فوراً روک دیا، مگر زہر اتنا خطرناک اور تیز اثر تھا کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اس زہر کے سبب شہید ہوئے اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسی زہر کے اثر کی وجہ سے چار سال بعد ایسے بخار میں مبتلا ہوئے جو بالآخر جان لیوا ثابت ہوا۔ (صحیح بخاری: ح ۱۷۲۶، صحیح مسلم: ح ۲۱۹۰، سنن ابوداؤد: ح ۴۵۱۱، ابن قیم الجوزیہ، زاد المعاد، ج ۱، ص ۵۴۸)

غالب گمان یہی ہے کہ یمنی یہودیوں نے ابرہہ کو مکہ پر حملہ کرنے پر آمادہ کیا کیونکہ وہ اپنی الہامی کتابوں کے ذریعے جان چکے تھے کہ مکہ میں آخری نبی کی ولادت کا وقت قریب ہے۔ اس حملے سے ان کا مقصد یہ تھا کہ آنے والے نبی کو اس کی ماں کی کوکھ میں ہی مار ڈالا جائے۔ سوال یہ ہے کہ وہ اس آخری نبی سے اتنے خوفزدہ کیوں تھے؟ دراصل وہ نہیں چاہتے تھے کہ یہود کے اصل چہرے سے نقاب ہٹایا جائے اور ان کے حقیقی کرتوتوں سے دنیا کو آگاہ کیا جائے۔ فن دینداری اور ساہوکاری کے جس پیشے سے وہ منسلک تھے، اس کے ذریعے انہوں نے ایک عالم کو اپنے دامن فریب میں الجھا رکھا تھا۔ ان کے تمام تر مفادات اس فن دینداری اور ساہوکاری سے وابستہ تھا، جس کا خاتمہ آنے والے نبی کے ہاتھوں ہونے والا تھا۔ لہٰذا انہوں نے سر توڑ کوشش کی اس نبی کو دنیا میں آنکھ کھولنے کا موقع ہی نہ دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں آنا ہی تھا، لہٰذا اصحابِ فیل اور ان کے شر پسند یہودی ساتھیوں کے ناپاک عزائم خاک میں مل گئے۔

يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ O

''یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں حالانکہ اللہ اپنا نور کامل کر کے رہے گا، خواہ کافروں کو کتنا ہی بُرا لگے''

مسائل میراث اور
ہمارے اُجڑتے خاندان
(حصہ سوم)

حافظ مختار احمد گوندل

حقوقِ وراثت کی ادائیگی میں ایک بڑی کوتاہی یہ کی جاتی ہے کہ خواتین کو بعض اوقات ان کے حق سے اس لئے محروم رکھا جاتا ہے کہ شادیوں پر جہیز کی صورت میں اس قدر مال دے دیا تھا اور اب وراثت کی تقسیم میں اسی اخراجات منہا کر دیے جائیں یا پھر کلیتًا وراثت سے محروم کر دیا جائے۔عورتوں کو جہیز میں کچھ سامان دے کر میراث میں جو ان کا حق بنتا ہے اس سے محروم کر دیا جانا، ہندوانہ رسم ہے حالانکہ میراث عزیز و اقارب کے وہ مالی حقوق ہیں جن کی ادائیگی سے اخوت و ہمدردی اور محبت و مروّت بڑھتی ہے جبکہ دوسروں کے مالی حقوق دبانا اللہ پاک کے احکامات کی خلاف ورزی اور اس کے عذاب کو دعوت دینا ہے اور جو شخص اپنی زندگی میں اسلام کے قوانین وراثت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنے مال سے ورثاء کا بعینہٖ اسی طرح خیال رکھے جیسے بعد از مرگ اس کے مال میں ان کے مالی حقوق ہیں تو اعزہ و اقارب بھی اس کی درازیٔ عمر کی دعائیں کرتے ہیں۔راقم السطور کا مقصود یہ ہے کہ عام زندگی کے روزمرہ معمولات میں آدمی احسان و انصاف کو قائم و دائم رکھے۔خاندانی امن و سکون اور طولِ حیات کا یہی ابدی راز ہے۔

اسلام تو مرد و عورت کو حقِ وراثت دیتا ہے لیکن جب انہیں ان کے حق سے محروم کر دیا جائے تو ان میں اپنے حقوق کے حصول کی بیداری کی وہ لہر پیدا ہوگی جیسے یورپ میں پاپائیت نے لوگوں کو ان کے حقوق سے محروم رکھا تو ردّعمل کے طور پر وہاں سیکولرزم کی تحریک اٹھی اور مذہبی و

خاندانی نظام کوتہس نہس کر دیا گیا لیکن جب ہم خود بھی ایسی ناانصافی کو روکنے میں اپنا کوئی کردار ادا نہیں کریں گے تو ہمارا حشر بھی اہل یورپ جیسا ہی ہوگا۔ کسی انسان کے فوت ہونے کے بعد اس کے مال و جائیداد پر کسی ایک کا حق نہیں ہے بلکہ اب یہ میت کے ان ورثاء کی امانت ہے جن کا قرآن مقدس نے اس میں حصہ ٹھہرایا ہے اس امانت کو جلد از جلد اس کے وراثوں کے حوالے کریں اور کسی وارث کو اس کے حصہ سے محروم نہ کریں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ معاشرے کے غیر شرعی رسم ورواج کو ختم کیا اور اللہ تعالیٰ کی شریعت کو نافذ کرنے کی کوشش کی جائے اگر ملک میں سیاسی سطح پر اللہ کی شریعت نافذ نہیں ہے تو کم از کم ہم ان وراثتی تقسیم ایسے معاملات میں تو اللہ کے حکم کو نافذ کریں جہاں ہمارا اختیار ہے۔ وراثت کا حق وہ حق ہے جو کسی وارث کے معاف کرنے سے بھی دائمی طور پر ساقط نہیں ہوتا بلکہ جب چاہے جس وقت چاہے وہ دوبارہ اپنے حصے کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ کیونکہ یہ الٰہی قانون ہے جس نے اسے مالک بنایا۔

عام طور پر مسلمان خاندانوں میں یہ احساس پایا جاتا ہے کہ جہیز کی شکل میں جو دے دیتے ہیں وہ وراثت میں اس کا ایک حصہ شمار ہوگا۔ کیونکہ جہیز دینا لڑکی والوں کی ایک مجبوری ہے اور بعض اوقات لڑکے والوں کی طلب بھی ہوتی ہے اور اگر مجبوری نہ بھی ہو تو نمود ونمائش کے لیے اپنی مرضی کے مطابق بھی جہیز تیار کیا جاتا ہے۔ کچھ یہی صورت حال بیٹوں کی شادیوں پر ہوتی ہے۔ میراث کی تقسیم کے موقع پر بیٹوں کی شادی پر اخراجات کو تو کسی بیٹے کی وراثت سے محرومی کا باعث نہیں گردانا جاتا تو پھر یہ ناانصافی یا احساس لڑکیوں کی وراثت پر ہی کیوں پیدا ہوتا ہے؟ جبکہ اسلام نے تو سب سے پسندیدہ شادی سب سے کم خرچ والی شادی قرار دی ہے۔

جہیز کا ایک تاریک پہلو اور عورت کی وراثت سے محرومی کی دوسری صورت عموماً اس سے معاف کرنے یا کرانے کی ہوتی ہے۔ اگر کوئی اپنا حصہ معاف نہ کرے تو پھر ایسے حالات پیدا کئے جاتے ہیں یعنی میکہ یا وراثت، مجبوراً اسے ایک کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ حالانکہ معاف کرنے کرانے میں دلی رضا مندی کا ہونا ضروری ہے۔ معاف کرنے کرانے کے اس عمل سے تقسیم میراث کا بابرکت سلسلہ تعطل کا شکار ہو جاتا ہے۔

بعض اوقات موروثی جائیداد کی تقسیم کو خاندانی وجاہت کے خاتمہ کے مترادف بھی قرار

دیا جاتا ہے، خصوصاً زرعی رقبہ جات کے حوالہ سے۔ بہرحال کسی کو اس امر (معافی) پر مجبور نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ ان کا حق ہے۔ جہاں تک جائیداد کی تقسیم ہے تو اسلام ارتکاز مال و جائیداد کو پسند نہیں کرتا:

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَىْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابO (الحجادلہ 7:59)

''جو (مال) بھی اللہ بستیوں کے لوگوں سے اپنے رسول کی طرف پلٹا دے، وہ اللہ اور رسول اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مساکین اور مسافروں کے لئے ہے۔ تاکہ وہ تمہارے مالداروں کے درمیان ہی گردش نہ کرتا رہے، جو کچھ رسول تمہیں دیں وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تم کو روک دیں رک جاؤ اللہ سے ڈرو، اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔''

اس آیت کریمہ میں بیان کیا گیا ہے کہ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ مال صرف مالداروں کے درمیان ہی گردش کرتا رہے بلکہ دولت کا پھیلاؤ ہو اور تمام خلق اس سے مستفید ہو۔

کاش ہم اسلام کے قانونِ وراثت کے عملی ثمرات کا مشاہدہ کر لیں تو پھر ہمیں اندازہ ہوگا کہ یہ کتنا مفید اور بارآور ہے۔ اگر ایک عورت اپنا حصہ لے جاتی ہے تو دوسری اس گھر میں اپنا حصہ لے آتی ہے اور اس طرح توازن برقرار رہتا ہے۔ قانون میراث کو تو اس حیثیت سے بھی امتیازی مقام حاصل ہے کہ اللہ رب العزت نے اس کی جزئی تفاصیل کو قرآن مجید میں بیان کر دیا ہے۔

تقسیم وراثت اور حقوقِ نسواں

تقسیم وراثت میں بنیادی اکائی (Basic Unit) عورت کا حصہ ہے جسے بنیاد بنا کر باقی ورثاء کے حصوں کا حساب کیا گیا ہے یعنی لڑکے کا حصہ نکالنے سے پہلے لڑکی کا حصہ متعین کرنا ہوگا جس کو بنیاد بنا کر لڑکے کے حق کی تعیین کی جائے گی۔ اس سے لڑکیوں کے حق کی اہمیت کا

اندازہ ہوتا ہے۔ جو عورت کی تخلیقی و تربیتی ذمہ داریوں کی افادیت و اہمیّت اور بذات خود عورت کی بلند حیثیت پر دلالت کرتی ہے۔ جس معاشرہ میں بیٹیاں زندہ درگور کر دی جاتی ہوں، وراثت و جائیداد تو درکنار وہ فقط زندگی کو ترستی ہوں، وراثت صرف صحت منداور جنگ جو افراد کا مقدر ہو، تو ان حالات میں اسلام انہیں اس قدر فراواں حصے عطا فرمائے! کیا اتنا احسان اور حقوقِ نسواں کا لحاظ دنیا کے کسی اور مذہب میں بھی ہے؟ مغرب حقوق کے نام پر عورت کو خاندانی وقار سے محروم کر رہا ہے۔ عزتِ نفس اور احترام کے الفاظ ڈکشنریوں کی زینت بن چکے ہیں۔ جبکہ اسلام وراثت میں مرد و عورت کے مابین تناسبی تقسیم کا درس دیتا ہے۔ بعض مواقع پر عورت کے مقابلے میں مرد کا دگنا حصہ اس لئے ہے کہ عورت شادی سے پہلے یا بعد اپنے مال اور کمائی پر قانونی حق رکھتی ہے، جبکہ مرد کی کمائی میں پورے خاندان کو حق دار گردانا جاتا ہے بلکہ اس کی ادائیگی بھی فرض ہے۔ گھر کے تمام اخراجات کا ذمہ دار بھی صرف مرد ہی ہے، معاشی اور معاشرتی تقریبات اور بے شمار دیگر امور کی انجام دہی مرد ہی کی ذمہ داری ہے۔ عورت پر کوئی بھی معاشی ذمہ داری نہیں۔ عورت اگر بیٹی ہے تو باپ، بہن ہے تو بھائی، دونوں نہیں تو قریب ترین مردوں (مثلاً چچا وغیرہ)، ماں ہے تو اولاد اور بیوی ہے تو خاوند کی کفالت سے مستفید ہوتی ہے۔ عورت ملازمت یا کاروبار کی صورت میں کمارہی ہو تو اگر چاہے تو اپنی کمائی گھر میں استعمال کرے یا بچّوں پر خرچ کرے، یہ اس کی اپنی مرضی پر موقوف ہے مگر یہ اس کی قانونی ذمہ داری نہیں۔ اپنی آمدنی کی خود ہی کلیتًا مالک ہے۔ اپنے سرمایے سے کاروبار کرے تو اس کے نفع یا اس کی دولت میں تصرف شوہر یا کسی دوسرے کو اس کی اجازت کے بغیر نہیں ہو، جبکہ بیوی ضرورت کے مطابق شوہر کے مال سے لینے کی مجاز ہے۔ گھر کا تمام خرچ اور بچوں کی تعلیم وغیرہ شوہر کی ذمہ داری ہے۔ وراثت میں مرد کے مقابلے میں بعض مواقع پر نصف حصہ اس کے کم تر ہونے کی دلیل نہیں بلکہ عورت اور مرد کے انتظامی فرائض اور ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کی بنا پر ہے۔ اگر ایک انتظامی عہدہ پر فائز شخص مالی وسائل سے محروم ہو تو وہ اپنے فرائض کی بجا آوری میں ناکام ثابت ہوگا۔ مانعینِ زکوۃ کے خلاف جہاد کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔

وراثت کی تقسیم تو تجہیز و تکفین، زکوٰۃ، قضا روزوں کا کفارہ، قرض اور حق مہر وغیرہ کی ادائیگی کے بعد ہوا کرتی ہے۔ وراثت میں وہ چیزیں شامل نہیں ہوں گی، جو مورث نے اپنی زندگی

میں ہبہ کی ہوں اور اس کی ملکیت سے نکل چکی ہوں یعنی اپنی زندگی میں اگر اپنی تمام اولاد کو یکساں رہائشی سہولیات (ان کے نام کر کے) فراہم کرے تو اس سے اپنی 'پراپرٹی' تو یقیناً اس کی 'ذاتی ضرورت' کے مطابق رہ جاتی ہے تاہم اسے اپنی وراثت کا شرعی اصولوں کے مطابق تقسیم نہ ہونے کے خوف سے نجات مل جاتی ہے۔ جائیدادوں کی تقسیم میں نزاعات، صرف ورثاء کو ہی نہیں بلکہ 'وراثت' جلد پانے کے لئے 'مورث' کو بھی بعض اوقات عذاب سے دوچار کر دیتی ہے۔ اسے بھی ابدی نیند سلانے کے منصوبے بننے لگتے ہیں یا اس کے جلد مرنے کی 'تمنائیں' تو ضرور زبانوں پر آنے لگتی ہیں۔ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ متوقع ورثاء کو بھی ٹھکانے لگا دیا گیا۔ ایک سگے بھائی نے دوسرے معصوم (Teenage) سگے بھائی کو محض اس لئے قتل کر دیا کہ وہ متوقع وارث تھا تاکہ جائیداد تقسیم نہ ہو۔ نفسانفسی کے اس دور میں بہتر یہ ہے کہ صاحب مال بتدریج اپنے 'متوقع وارثوں' کو اپنے اثاثے ہبہ کر جائے تاکہ 'ترکہ' اتنا نہ ہو کہ اس پر لڑائی جھگڑے کا امکان ہو۔

اپنی زندگی میں اپنا مال اولاد کو بطور ہبہ دینا (بشرطیکہ کسی کو نقصان نہ ہو) جائز ہے، لیکن اولاد کے مابین تسویہ و تعدیل بھی ضروری ہے۔ گو یہ تقسیم وراثت کے 'شرعی اصولوں کے مطابق تقسیم' کی آئینہ دار نہ ہو، کیونکہ کوئی شخص یہ چاہے کہ میں اپنی زندگی میں اپنی وراثت قانونِ وراثت کے مطابق تقسیم کروں تو یہ جائز بھی نہیں اور ممکن بھی نہیں۔ تقسیم وراثت کا تعلق مورث کی وفات سے ہے، مرنے کے بعد ہی وراثت کی شرعی تقسیم ہو سکتی ہے۔ کوئی اپنی زندگی میں اپنی اولاد (مثلاً دو بیٹوں اور دو بیٹیوں) کو اپنا ترکہ شرعی تقسیم کے مطابق دے دیتا ہے اور اس کی زندگی میں اس کی اولاد میں کوئی فوت ہو جائے یا کوئی نیا وراث پیدا ہو جائے تو یہ تقسیم از سر نو ہو گی۔ تاہم یہ اصول بھی پیش نظر رہے کہ اگر اپنی زندگی میں جائیداد کی تقسیم کرے تو امکانی طور پر وراثتی اصولِ تقسیم کو سامنے رکھتے ہوئے منصفانہ انداز ہو، کوئی نہیں جانتا کس گھڑی زندگی کی شام ہو جائے، پھر کوئی وارث شکوہ کناں ہو اور مورث کی جمع پونجی کچہریوں میں ریوڑیوں کی طرح بٹنا شروع ہو جائے، گو وراثتی قوانین مرنے کے بعد لاگو ہوتے ہیں زندگی میں نہیں، تاہم جائیداد بیٹوں اور بیٹیوں میں برابر برابر تقسیم ہو، البتہ اپنی خواہش، کسی کی خصوصیت، خدمت کے صلہ یا کسی اور جائز وجہ سے کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے۔ اسلام نے مختلف حیثیتوں ماں، بیٹی، بہن، بیوی اور کئی دوسری حیثیتوں سے عورت

کو وراثت میں حصہ دار بنایا ہے۔ قانونِ وراثت میں عورت (زوجہ، ماں، بیٹی اور بہن) کے حصوں کا اجمالاً تذکرہ درج ذیل ہے۔

زوجہ کا حصہ: اس کی دو صورتیں ہیں: (1) میّت کی کوئی اولاد نہ ہو۔ اس صورت میں بیوی کو ترکہ کا چوتھائی حصہ ملے گا۔ (2) میّت صاحب اولاد ہو۔ اس صورت میں بیوی (یا سب بیویوں کو، اگر ایک سے زائد ہوں) آٹھواں حصہ ملے گا۔

ماں کا حصہ: اس کی تین صورتیں ہیں: (1) بے اولاد مورث کے والدین زندہ ہوں تو ماں کو ایک تہائی حصہ ملے گا اور بقیہ باپ کو ملے گا۔ (2) صاحبِ اولاد مورث بیٹے کی وراثت میں ماں اور باپ کو برابر حصہ (1/6) ملتا ہے۔ وارثوں میں صرف ماں باپ اور شوہر یا بیوی ہو تو پھر شوہر یا بیوی کا آدھا یا چوتھائی دینے کے بعد جو آدھا یا تین چوتھائی حصہ بچے گا اس کا تہائی حصہ ماں کو ملے گا۔ (3) مورث کے بھائی بہن اور والدین دونوں زندہ ہوں تو ماں کو (1/6) حصہ ملے گا۔

جب ورثاء میں دو بیٹے، ایک بیٹی، نانا اور نانی ہوں تو نانی کو 1/6 حصہ جبکہ نانا کو کچھ نہیں۔

بیٹی کا حصہ: مورث کی صرف ایک بیٹی ہو اور کوئی بیٹا نہ ہو تو بیٹی کو نصف (1/2)، دو سے زائد بیٹیاں ہوں تو اُنھیں دو تہائی حصہ دیا جائے گا۔ بقیہ مورث کے بھائی، بہن اور دیگر ورثاء میں تقسیم ہوگا۔

جب بیٹی یا بیٹیوں کے ساتھ بیٹا یا بیٹے موجود ہوں تو بیٹی یا بیٹیاں عصبہ لغیرہ ہو جاتی ہیں اور اس حالت میں انہیں بیٹوں کا آدھا ملتا ہے۔

بہن کا حصہ: بہن کی تین اقسام ہیں:

سگی بہن، علاّتی بہن (باپ شریک بہن) اور اخیافی بہن (یعنی ماں شریک بہن)

اس فرق کے حساب سے ان کے حصوں میں فرق ہوگا۔ یاد رہے کہ بہن اسی صورت میں وارث ہوگی جب مورث کا نہ لڑکا ہو اور نہ باپ۔

سگی بہن کا حصہ: بے اولاد مورث کے والدین زِندہ نہ ہوں۔ ایک بہن ہے یا ایک بھائی تو ہر ایک کو (1/6) اور ایک سے زیادہ ہوں تو (1/3) حصہ میں سب شریک ہونگے۔

اگر صرف ایک بہن ہو نہ اولاد ہو نہ بھائی تو بہن کو آدھا حصہ ملے گا۔

اگر دو یا زیادہ سگی بہنیں ہوں تو دو تہائی میں سب کو برابر برابر ملے گا۔

اگر بہن یا بہنوں کے ساتھ سگا بھائی بھی ہوتو بہنیں عصبہ لغیرہ ہوکر بھائی کا آدھا حصہ پائیں گی۔ اگر بہن یا بہنوں کے ساتھ مورث کی بیٹی یا پوتی وغیرہ ایک یا زیادہ ہوں تو بہنیں عصبہ مع غیرہ ہوکر ذوی الفروض سے بچا ہوا سب پاتی ہیں۔

علاّتی بہن کا حصہ: اس کے حصہ پانے کی پانچ صورتیں ہیں:

اگر صرف ایک علاتی بہن ہو نہ اولاد ہو نہ بھائی تو بہن کو آدھا حصہ ملے گا۔

اگر دو یا زیادہ علاتی بہنیں ہوں تو دو تہائی میں سب کو برابر برابر ملے گا۔

اگر ایک سگی بہن اور ایک یا زیادہ علاّتی بہنیں ہوں تو علاّتی بہنوں کا حصہ چھٹا ہوگا۔

اگر علاّتی بہن کے ساتھ علاتی بھائی بھی ہوتو اس کا آدھا حصہ پائے گی۔

اگر مورث کی ایک یا زیادہ بیٹی کے ساتھ سگی بہن کی بجائے سوتیلی بہنیں ہوں لیکن سوتیلا بھائی نہ ہوتو علاّتی بہنیں ذوی الفروض سے بچے ہوئے کل ترکہ کی حقدار ہوں گی۔

اگر مورث کا بیٹا یا باپ یا سگا بھائی یا سگی بہن عصبہ مع غیرہ کی حیثیت سے ہوں یا دو سگی بہنیں ہوں تو علاتی بہن کو حصہ نہیں ملے گا۔

اخیافی بہن کا حصہ: اخیافی بہن کا حصہ بعینہٖ وہی ہے جو اخیافی بھائی کا ہوگا۔ اخیافی بہن کے حصہ پانے کی تین صورتیں ہیں: ایک اخیافی بہن یا بھائی ہوتو اسے ترکہ کا چھٹا حصہ ملے گا۔ اگر ایک سے زیادہ اخیافی بھائی یا اخیافی بہنیں ہوں تو تہائی میں سے ہر ایک کو برابر ملے گا۔ اگر اخیافی بھائی کے ساتھ مورث کے باپ دادا یا بیٹے، پوتے، یا بیٹی، پوتی زندہ ہوں تو اخیافی بھائی بہن محروم ہوں گے۔

یہاں یہ بھی پیش نظر رہے کہ مرد کو صرف وارث اور عورت کو نہ صرف وراثت بلکہ شوہر کی جائیداد اور مال و متاع کے علاوہ عدّت کے ایام میں بھی عورت کے اخراجات کی ذمہ داری شوہر پر ہے اور عدت کے اختتام پر عورت کو نکاح ثانی کا حق بھی حاصل ہے۔ عورت کے لیے نہ صرف وراثت، بلکہ اس کے سرمایے کے تحفظ اور حصول کے کئی اور ذرائع بھی متعین ہیں۔ عورت کو اپنے اس محفوظ سرمائے کے استعمال میں کلّی طور پر خود مختار بھی بنا دیا گیا۔ بیوی کی کمائی میں شوہر کا کوئی حصہ نہیں، اسلام نے عورت پر مالی ذمہ داریاں ڈالے بغیر اس کے لیے آمدنی کے اتنے راستے اور اس کے سرمایے کے تحفظ کے لیے اتنے اقدامات کئے ہیں، دنیا کے کسی نظام میں بھی

ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔عورت کو جتنی اہمیت اور اس پر جتنے احسان اسلام نے کیے ہیں اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مالی عبادات میں مرد وعورت کو مساویانہ طور پر احکام عطا ہوئے۔ مثلاً زکوۃ وصدقات، حج وقربانی اور کفارات وغیرہ میں صاحب نصاب ہونا شرط ہے خواہ مرد ہو یا عورت، میاں ہو یا بیوی، بیٹا ہو یا بیٹی کوئی فرق روا نہیں رکھا گیا۔اسلام نے عورت کو با اختیار بنایا ہے۔ وہ مثالی حقوق دیے ہیں جو آج تک کوئی تہذیب یا مذہب اسے نہیں دے سکا لیکن کسی مرد و عورت کو مسلم معاشرے میں حقوق سے تجاوز کی بھی قطعا اجازت نہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ مرد و عورت کو آج بھی ہوس مال وجائیداد اور مختلف حیلوں سے وراثت کے حق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

سگے بھائی بہنوں میں وراثتی نزاعات سے تھانے، جیلیں اور کچہریاں آباد تو ہیں مگر ہماری اجڑتی خاندانی اقدار اور نسل نو کی تباہی سے حفاظت کا کوئی حصار نہیں جبکہ ان کی تباہی کی زندہ علامت وراثت کی تقسیم کے قوانین سے لاعلمی اور اگر علم ہو بھی تو اس کی من چاہی تقسیم ہے جو گھریلو سکون کی بربادیوں کی باعث ہے۔

اسلام کی رو سے تمام انسان مساوی ہیں۔اگر کسی کو کسی انسان پر برتری اور کوئی مقام حاصل ہے تو وہ عمل اور عقیدہ کی بنیاد پر ہے۔اسلام سے قبل ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب ادیان واقوام عالم میں خواتین کی حیثیت منقولہ جائیداد سے زیادہ نہیں تھی۔ چودہ سو سال قبل اس وقت جب کوئی انسان ان اصولوں سے آشنا نہیں تھا، ایران و روم جیسی ریاستیں بھی ان وراثتی قوانین سے نا آشنا تھیں۔کسی فکری کشمکش، انقلاباتِ زمانہ اور تحریکوں کے دباؤ کے نتیجے میں نہیں بلکہ محسن انسانیت ﷺ پر وحی الٰہی کے نزول کے نتیجے میں یہ نوع انسان کو عطا کئے گئے جبکہ دیگر ادیان واقوام عالم میں تقسیم میراث کی بھی صورت حال کچھ ایسی تھی:

یہودی مذہب میں میراث کی تقسیم اس طرح ہوتی کہ اگر ورثاء میں مرد نہ ہوں تو پھر عورتوں کو میراث سے حصہ ملتا ورنہ وہ محروم رہتیں، چاہے وہ ماں، بہن، بیٹی، بیوی یا کوئی اور رشتہ دار ہوں۔ جیسے اگر بیٹا موجود ہے تو بیٹی کو کچھ نہیں ملے گا، بیوی کو تو شوہر کے ترکہ سے کسی بھی صورت میں کچھ بھی نہ ملتا۔

رومیوں کے نظام میراث میں عورت کو مرد کے برابر حصہ ملتا لیکن بیوی کو اپنے شوہر کے

ترکہ سے کچھ بھی نہیں ملتا تھا تاکہ کسی خاندان کا مال دوسرے خاندان میں منتقل نہ ہو، یہاں تک کہ اگر کسی عورت نے اپنے باپ سے میراث پائی ہو اور وہ مرجائے تو اس کے ترکہ سے اس کی اولاد کی بجائے اس کے بھائیوں کو حصہ ملتا تھا۔

قدیم مشرقی سامی اقوام آشوری، تورانی، سریانی، شامی اور یونانی قومیں جو قبل مسیح مشرقی خطوں میں آباد تھیں، وہاں تقسیم میراث کا نظام یہ تھا کہ باپ کے بعد بڑا بیٹا باپ کی جگہ لیتا، اگر وہ موجود نہ ہو تو مردوں میں سب سے زیادہ ارشد مرد، پھر بھائی، ان کے بعد چچا۔ عورتیں اور بچے میراث سے محروم کردیے جاتے۔

قدیم مصریوں کے اشترا کی نظام میراث میں میت کے تمام اعزہ واقرباء جن میں اس کا باپ، ماں، بیٹے، بیٹیاں، بھائی، بہنیں، چچے، ماموں، خالائیں اور بیوی سب شامل ہوتے اور سب کو برابر حصہ ملتا۔ جن میں مرد، عورت اور چھوٹے، بڑے میں کوئی تمیز نہیں ہوتی تھی۔

ہندوستان میں صنفِ نازک مرد کے مقابلہ میں محض ایک داسی تھی، جس کا اپنا کوئی وجود تھا نہ رائے اور نہ پسند، ساری زندگی وہ مرد کی خدمت کرتی اور اس کے مرنے کے بعد، اسی کے ساتھ زندہ جلا دی جاتی جسے 'ستی' کی رسم کہا جاتا تھا، بیوہ عورت اور لڑکیوں کو حق وراثت ساڑھے تین ہزار سال پرانے ہندو مذہب اور تہذیب کو 1938ء، 17 جون 1956ء، 2000ء اور 2005ء میں کافی جدوجہد کے بعد فراہم ہوئے، جنہیں اسلام اور مسلمانوں کے اثرات سے ہی تعبیر کیا جاسکتا ہے یا پھر حقوق انسانی کے چارٹر 1948ء کا نتیجہ بھی ہوسکتا ہے۔ ہندوستان کی حکومت نے ہندو ایکٹ میں ترمیم کرکے 1956ء میں بیٹیوں کو باپ کی منقولہ جائیداد میں وراثت کا حق دار بنایا۔ پہلے مشترکہ خاندان کی ملکیت میں (میتا کشرا قانون کے تحت) بیٹیوں کا کوئی حق ہی نہیں تھا۔ ہندو وراثت کے اس آرڈی ننس میں کہا گیا کہ اگر کسی ہندو آدمی کا مشترکہ خاندان کی ملکیت میں بھی حصہ ہے اور اس کے ورثا میں (بیٹی، بیوہ، ماں وغیرہ) عورتیں بھی شامل ہیں تو انہیں بھی حصہ مل سکتا ہے بشرطیکہ اس نے اپنے حصہ کے بارے میں کوئی وصیت نہ کی ہو۔ نئے قانون 2000ء میں بیٹیوں کو بھی باپ کی منقولہ اور غیر منقولہ تمام جائیداد میں بیٹوں کے برابر حصہ دیا گیا۔ ہندو وراثت قانون ترمیمی 2005ء کے تحت دفعات 4، 6، 23، 24 اور 30 میں

ترمیم ہوئی۔اس میں مشترکہ وارثوں کی جائیداد،مورث کی بیٹیوں کو بیٹوں کے مابین مساوی تقسیم کا حکم ہے۔ یہ وراثتی قوانین میں ترامیم عورتوں اور مردوں کے مساوی حقوق کی حامل ہونے کی بنا پر ایک اہم پیش رفت ہے۔

مغربی ممالک میں زمانہ قدیم سے عورت زبوں حالی کا شکار رہی ہے اگر یورپ کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو وہاں کے معاشرہ میں عورت کو کوئی مقام و مرتبہ حاصل نہ تھا،کلیسا نے تو عورت کو گناہِ آدم کا مجرم قرار دے کر عزت واحترام کا مقام دینے سے انکار کر دیا،حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے شادی نہیں کی اس لئے عیسائی معاشرہ میں عائلی اسوہ موجود نہیں،تحریف شدہ تورات بھی عورتوں کے حقوق کے بارے میں واضح ہدایت نہیں دیتی۔لہٰذا مسیحیت عورتوں کے حوالے سے کلیسائی رویہ کے تابع رہی ہے۔

اسلام کی آمد سے پہلے عرب میں لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کر دیا جاتا،اسلام نے اس وحشیانہ رسم کو سختی کے ساتھ ختم کر دیا،اہل عرب کے ہاں بیوگان بھی مرنے کے بعد ترکے کی طرح تقسیم ہو جاتیں،معاشرہ میں عورتوں کی عزت واحترام کا کوئی تصور نہ تھا اور نہ ہی زمانہ جاہلیت میں عربوں کے ہاں تقسیم میراث کا کوئی مستقل یا خاص نظام تھا، وہ لوگ دیگر مشرقی اقوام کے طریقوں پر چلتے۔ وہ اپنی میراث کے حقدار صرف ہتھیار اٹھانے کے قابل مردوں کو ہی سمجھتے، عورتوں اور بچوں کو کلیتاً محروم رکھتے اور اگر کوئی عرب مرجاتا تو اس کا بڑا بیٹا اپنی حقیقی ماں کے علاوہ دیگر بیویوں کا بھی اسی طرح مالک بن جاتا جس طرح اپنے باپ کے بقیہ ترکہ کا،نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ شادی کر لیتا اور انہیں کچھ بھی مہر نہ دیتا یا اپنی مرضی سے ان کی شادی کسی اور کے ساتھ کر دیتا اور رقم حق مہر خود کھا لیتا یا اگر چاہتا تو عمر بھر انہیں بغیر شادی ہی رہنے پر مجبور کرتا۔ یہ عرب کا دستور تھا کہ بڑے بیٹے کو اس کا مال مل جاتا اور عورتیں بالکل محروم رہتیں۔انہی حالات میں اسلام نے احکام وراثت نازل فرما کر سب کی مساویانہ حیثیت قائم کر دی،خواہ قرابت حقیقی ہو،بوجہ عقد زوجیت ہو یا بوجہ نسبت آزادی،یعنی وارث تو سب ہوں گے اور حصہ بھی سب کو ملے گا کم و بیش ہو۔ (جاری ہے)

الیکشن اور دینی جماعتیں

محمد فہیم
تیمر گرہ ضلع دیر پائین

ملک میں متوقع انتخابات 2018ء کے پیش نظر تقریباً ہر قابل ذکر سیاسی پارٹی نے کسی نہ کسی شکل میں انتخابی مہم شروع کر رکھی ہے۔ اس میں نمایاں ترین پی پی پی، مسلم لیگ (ن) اور تحریک انصاف ہیں لیکن مذہبی سیاسی جماعتوں میں بھی دو معروف جماعتیں جماعت اسلامی اور جمعیت علماء اسلام (ف) کسی سے پیچھے نہیں۔ مؤخر الذکر کا حالیہ صد سالہ جشن منعقدہ نوشہرہ تو اس سلسلہ کی چوٹی ہی ہے جسے نہایت کامیابی کے ساتھ منعقد کیا گیا۔ مجموعی طور پر مولانا فضل الرحمٰن صاحب کی قیادت میں جمعیت العلماء کی یہ بھرپور سیاسی قوت کا مظاہرہ تھا اور انتظامی امور کے حوالہ سے اس عظیم اجتماع کو بطور احسن منعقد کرانے سے جمعیت کے کارکنوں کی تنظیمی استعداد اور کام کرنے کی صلاحیتوں کو داد دینا چاہیے جنہوں نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ اس عظیم اجتماع کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اہل فہم جانتے ہیں کہ ہماری 'دینی' جماعتوں میں اہلیت بھی ہے، کام کرنے کا جذبہ بھی ہے اور اسلامی نظام کو برپا کرنے کی تڑپ بھی ہے۔ یہ تمام جماعتیں اور جمعیتیں مختلف ناموں اور مختلف بینروں کے تحت انتخابات میں بھرپور حصہ بھی لیتے ہیں اور ان کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ وہ قومی سطح پر انتخابات میں اس لیے شرکت کرتے ہیں کہ وہ اس طریقہ پر ایک دن انتخابات میں اکثریت حاصل کر کے ملک میں اسلامی نظامِ عدل کا نفاذ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ (اس مختصر مضمون میں اس پر تبصرہ تو نہیں کیا جا سکتا کہ آیا اس راستے سے نظام بدل سکتا ہے یا نہیں؟ اور

خصوصاً پاکستان کے مخصوص سوشل اکنامک اور پولیٹکل حالات میں انتخابات نظام بدلنے کا کوئی مؤثر ذریعہ بن بھی سکتے ہیں؟) یہاں صرف دو نکات پر ان مذہبی سیاسی جماعتوں کے ضمن میں چند معروضات پیش خدمت ہیں۔ یہ معروضات صرف اور صرف "اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃ" کے جذبے کے تحت پیش کیے جارہے ہیں۔

کچھ دن پہلے اخبارات میں یہ خبر نظر سے گذری کہ ہماری بڑی مذہبی سیاسی جماعتوں کے اکابرین میں اتحاد کے لیے سلسلہ جنبانی شروع ہوچکی ہے۔ اگر تو یہ خبر درست ہے تو ہر پاکستانی مسلمان کی یہ خواہش اور دعا ہوگی کہ اللہ تعالیٰ ان جماعتوں کو توفیق دے کہ وہ خلوص کے ساتھ متحد ہوکر ''اسلامی ووٹ'' کو منقسم نہ ہونے دیں اور اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو اُمید رکھنی چاہیے کہ یہ ''اسلامی اتحاد'' ایک بڑی قوت بن کر اُبھرے گی اور بہت ممکن ہے کہ نتیجے میں مملکت خداداد پاکستان اپنے اصل ہدف یعنی نظامِ قرآنی کی طرف گامزن ہو۔ لیکن ہماری 70 سالہ تاریخ سے حاصل شدہ اب تک تجربہ کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں رہا۔ حالانکہ صرف ایک دفعہ کامیاب اتحاد کرکے ہم نے ایم ایم اے کی صورت میں کافی کامیابی حاصل کی تھی اور پہلی دفعہ قومی اسمبلی میں دینی جماعتوں کی مجموعی نمائندگی خاصی مؤثر ہوچکی تھی۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ خود اپنی تاریخ ہے۔ ایک عام پاکستانی مسلمان جسے پاکستان کا اصل مقصد اور ہدف معلوم ہو وہ جب پاکستان میں مذہبی جماعتوں کی باہمی تفریق اور ایک دوسرے کے خلاف معاندانہ رویے کو دیکھتا ہے تو اس کے دل سے ایک ہوک سی نکلتی ہے کہ اے خدا! یہ تو تمام اسلام کا نام لیتے ہیں، اسلامی نظام کو برپا کرنا ہر ایک اپنا ہدف سمجھتا ہے، ان کے دعوے اور بیانات اسلام ہی کے گرد گھومتے ہیں، ایک منزل اور ایک ہی نشانے کا وہ دعویٰ کرتے ہیں پھر وہ کیا عناصر ہیں، کونسی قوتیں ہیں اور ان کے اندر کونسے رجحانات ہیں جو ان کو نہ صرف ایک دوسرے کے مقابلے میں لا کھڑا کرتے ہیں بلکہ بسا اوقات وہ سیکولر عناصر کے ساتھ مل کر ان کے لیے پاسنگ کا کام دیتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے وہ اسلام ہی کو بدنام نہیں کرتے بلکہ خود بھی انہی سیکولر عناصر کے لیے تضحیک کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ ان جماعتوں اور جمعیتوں کے متعلق چند حقائق کی طرف توجہ مبذول کرنا ضروری ہے۔

پاکستان میں ایک معروف اور بڑی جماعت ایسی بھی ہے جو سیاسی دنیا سے علیحدہ اپنے

کام میں مصروف دکھائی دیتی ہے۔ اسے یہ فکر لاحق ہی نہیں کہ اسلام کے نام پر حاصل کی گئی اس مملکت میں اسلام کس حد تک حاوی ہے۔ اس ملک کی معاشرت، معیشت، سیاست، تعلیمی نظام، مالی نظام وغیرہ کن ہاتھوں میں ہے۔ یہاں کا ابلاغِ عامہ (پرنٹ الیکٹرانک اور سوشل میڈیا) کس تھوک کے حساب سے بے حیائی، اباحیت اور فحاشی کو پھیلا رہا ہے۔ کس حساب سے این جی اوز اور بیرونی ملک دشمن عناصر مختلف ناموں سے یہاں بیٹھ کر اسلام اور پاکستان کی جڑیں کھودتی ہیں۔ ایسے مخلص مگر نہایت سادہ لوح انسانوں کو ان چیزوں کا پتہ ہی نہیں۔ وہ تو یہی سمجھتے ہیں کہ مسجدیں بھری ہوتی ہیں، روزے ہو رہے ہیں، عمرے اور حج ہو رہے ہیں۔ لہٰذا اسلام جاری بھی ہے اور حاوی بھی ہے۔ ان کی تحریک میں یہ بات جگہ نہیں پاسکتی کہ حقیقت میں یہاں اسلام نافذ نہیں بلکہ چند مراسم عبودیت ہیں جو یقیناً ہو رہی ہیں اور یہ بھی اللہ کا بڑا فضل ہے کہ اس حد تک مذہبی معاملات چل رہے ہیں۔ ان حضرات کے نزدیک ''عمل صالحہ'' کا تصور بہت محدود ہے اور نتیجتاً اسلام کو ''دین'' کی حیثیت سے پاکستان میں نفاذ کی جو ضرورت ہے اس پر ان کی توجہ نہیں۔ اس معروف و مخلص جماعت کی مرکزی قیادت اور اکابرین کے لیے یہ بات قابل توجہ ہونی چاہیے کہ وہ معاشرہ میں نیکی اور اصلاح کو عام کرنے کے ساتھ دین کی بالادستی کے لیے بھی اسوہ رسول ﷺ کی روشنی میں لائحۂ عمل تیار کر کے اس پر عمل شروع کریں۔ جیسا کہ حضور ﷺ کی سیرت مبارکہ سے واضح ہے کہ منکرات تب ختم ہوں گے جب اسلام بحیثیت دین نافذ ہو اور ہر ایک برائی اور اچھائی کی قدر قرآن اور سنت رسول ﷺ کی روشنی میں دیکھی اور تولی جائے۔

دوسری کیٹیگری میں وہ معروف جماعتیں ہیں جو یہ سمجھتی ہیں کہ الیکشن کی راہ سے اسلام کا نفاذ ہو سکے گا۔ لہٰذا وہ نیک نیتی کے ساتھ اس عمل میں شریک ہیں اور اپنی علیحدہ علیحدہ جماعتیں اور جمعیتیں بنا کر ایک دوسرے کے مدمقابل آجاتی ہیں۔ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ ہماری معروف مذہبی / سیاسی جماعتیں مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں یا براہِ راست اتحادی ہیں اور یا بالواسطہ یا بلاواسطہ اقتدار کی ایوانوں پر براجمان سیاسی جماعتوں کے مددگار ہیں اور ان کو سپورٹ کر رہی ہیں حالانکہ وہ ہر کسی سے بہتر جانتے ہیں کہ طاقت کی ایوانوں پر اس وقت جو بھی سیاسی جماعتیں قابض ہیں وہ یقیناً مسلمان قیادتیں ہیں لیکن وہ سیاسی سطح پر مکمل طور پر سیکولر سوچ کے حامل

ہیں اوران سے اسلامی نظام اور شریعت قرآنی کے نفاذ کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی۔اس کے لیے سب سے بڑی شہادت ہمارا گذشتہ 70 سالہ قومی دورانیہ زندگی ہے۔ درمیان میں ایک فوجی ڈکٹیٹر نے کچھ نمائشی اور نیم دلانہ اقدامات کیے تھے مگر وہ صرف اپنی اقتدار کو طول دینے کی خاطر ہی تھے نہ کہ اصل دین کے نفاذ کے لیے۔تلخ حقیقت یہ ہے کہ ہماری مذہبی سیاسی جماعتیں اپنا اپنا پس منظر رکھتی ہیں اور وہ ان بعض تاریخی پس منظروں کی وجہ سے ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتی ہیں لہٰذا وہ کسی اتحاد کے قریب نہیں آتیں حالانکہ ان کو چھوٹی چھوٹی اور فروعی اختلاف کو ایک طرف رکھ کر اس بہت بڑے مقصد یعنی ''اسلامی نظام'' کے نفاذ کے لیے اکھٹا ہو کر اتحاد و اتفاق کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔اگر وہ ایسا کریں تو یقیناً ان کے مقابلہ میں سیکولر جماعتیں کامیابی حاصل نہ کرسکیں گی۔لیکن چند حقائق ایسے ہیں جنہیں دیکھ کر اور سمجھ کر ایک گونہ مایوسی ہو جاتی ہے جیسا کہ اوپر ذکر کیا جاچکا ہے۔ماضی میں ایم ایم اے بنی تھی اور اس اتحاد کی وجہ سے مذہبی جماعتوں کی ایک خاص تعداد مرکزی اسمبلی میں پہنچ چکی تھی لیکن بحیثیت مجموعی وہاں کوئی اسلامی کام تو نہ ہوسکا البتہ اس اتحاد نے ایک فوجی آمر کے ساتھ آخری حد تک تعاون کیا۔ان ہی دینی جماعتوں نے سترھویں ترمیم کو پاس کرانے میں مدد کی۔ایک غیر اسلامی حقوق نسواں بل کو اسمبلی میں موجود مذہبی جماعتوں نے غیر اسلامی بھی کہا اور پھر بھی ڈکٹیٹر سے راہیں جدا نہیں کی گئیں۔آصف زرداری کی حکومت سے ہماری ایک مذہبی جماعت نے ہر قسم کا تعاون کیا جبکہ وہ حکومت کسی بھی معاملہ میں اسلامی نظام کی ہمنوائی نہیں کرتی تھی۔اسی طرح ایک دینی جماعت اور خیبر پختونخواہ میں ایک بالکل نمایاں سیکولر جماعت کے درمیان ماضی میں شرکت اقتدار بھی رہی ہے اور ان کے درمیان ہر وقت ایک قسم کی ہمنوائی اور باہمی تعاون و اشتراک ہمیشہ سے چلا آیا ہے۔موجودہ وقت بھی اس جماعت کا مرکزی حکومت کے ساتھ مکمل تعاون ہے جس کے لیڈر شپ علانیہ طور پر اپنے لبرل ذہن کا اس حد تک مظاہرہ کرچکی ہے کہ ان کا ہندوؤں اور قادیانیوں کے لیے جو نرم گوشہ ہے انھوں نے اسے چھپانے کی کوئی مصلحتی کوشش بھی نہیں کی۔اسی طرح ہماری ایک بہت ہی منظّم مذہبی/سیاسی جماعت کے پی کے میں ایک سیکولر جماعت کی اتحادی ہے۔حالانکہ مذہبی جماعت سیکولر جماعتوں سے مل کر کسی بھی سطح پر دین کی بالادستی کے لیے کوئی کام نہیں کرسکتی۔اگر چہ اس مخلوط حکومت نے چند ایک

اصلاحات کر کے صوبائی حکومت میں کسی حد تک ٹرانسفرنسی لانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ایسے میں سوچنے سمجھنے والے لوگ کیسے اعتبار کریں کہ ہماری یہ مذہبی/سیاسی جماعتیں دین کی خاطر اور اسلامی نظام کے نفاذ کی خاطر ایک ہو کر اخلاص کے ساتھ ایک دوسرے سے مل کر ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلیں اور اگر وہ تمام بڑی جماعتیں اکٹھی ہو کر ایک پلیٹ فارم ایک ہی جھنڈے تلے اور ایک ہی نکاتی (ایجنڈے) یعنی نفاذِ اسلام کے تحت الیکشن میں اتریں تو ان شاءاللہ کامیابی ان کے قدم چومے گی اور اگر وہ حکومت نہ بھی بنا سکیں تو مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں وہ ایک بہت طاقتور پوزیشن میں ہوں گی اور برسر اقتدار جماعت کسی بھی غیر اسلامی ترمیم لانے کی جرأت نہ کر سکے گی لیکن اس اتحاد کے لیے آپ کو ذاتی پسند و ناپسند، فقہی اختلافات، ماضی کے متوازی پس منظر، سیٹوں کی حرص اور انانیت کی قربانی دینا ہوگی۔ کیونکہ یہ چھوٹی چیزیں اور مرغوبات اس بڑے مقصد یعنی ''قیامِ عدلِ اجتماعی'' کے مقابلے میں ہیچ ہیں اور اسی پر ہماری مذہبی لیڈر شپ کو فوکس کرنا ہوگا۔

یاد رہے کہ ہماری دینی جماعتوں کا بہت شاندار پس منظر بھی ہے اور ان میں اس وقت بہت بڑی بڑی علمی شخصیات بھی موجود ہیں اور اگر وہ سمجھتی ہیں کہ اس الیکشن کی راہ سے اسلامی نظام کا نفاذ ہو سکتا ہے تو کسی کو کوئی حق نہیں کہ ان کے اس دعویٰ کی نفی کریں۔ تاہم اتنا ضرور ہے کہ اگر دینی جماعتیں متحد نہیں ہوتیں تو وہ سیکولر قوتوں کے مقابلہ میں ہمیشہ ناکام رہیں گی اور زیادہ سے زیادہ حکومت کا ضمیمہ بنتی رہیں گی اور ایسی صورت حال میں دین کی کسی بھی قسم کی خدمت کرنے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ دین تو بس خیر خواہی ہے۔ اللہ کے لیے اس کی کتاب کے لیے، اس کے رسول ﷺ کے لیے، مسلمانوں کے رہنماؤں کے لیے اور عوام الناس کے لیے۔ (الحدیث)

روہنگیا کے مظلوم مسلمان جائیں ___ تو کہاں جائیں؟

(قسط اوّل)

ابو فیصل محمد منظور انور

؎ یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں، لا الہ الا اللہ

جب خلیفہ المسلمین ہارون رشید نے مسلمان مبلغین کو برما میں ارکان نامی علاقے میں بھیجا تب سے ہی اسلام برما میں پھیلنے لگا۔ آج برما کے مسلمانوں پر جو ظلم وستم ہو رہا ہے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ برما کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو مسلمانوں پر اس طرح کی قیامت ٹوٹنے کے کئی واقعات ملتے ہیں۔ 1559ء میں مذہبی عقائد کی آڑ میں جانور ذبح کرنے پر پابندی لگا دی گئی۔ حتیٰ کہ عید الاضحیٰ کے موقع پر بھی کسی مسلمان کو اجازت نہیں تھی کہ وہ کسی جانور پر چھری چلا سکے۔ 1752ء میں بھی جانوروں کے ذبح پر پابندی لگا دی گئی۔ 1782ء میں تو بادشاہ بودھا پایہ نے پورے علاقے کے مسلمان علما کرام کو سور کا گوشت کھانے پر مجبور کیا اور انکار پر ان سب کو قتل کر دیا گیا۔ برما کی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ اس واقعے کے بعد 7 دن تک برما کی سرزمین پر سورج طلوع نہیں ہوا۔ جس پر بادشاہ نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا، معافی مانگی۔ پھر ظلم وستم کی یہ داستان بڑھتے بڑھتے 1938ء تک جا پہنچتی ہے جب برمی بودھ برطانوی فوجوں کے خلاف جنگِ آزادی لڑنے میں مشغول تھے تو گولیوں سے بچنے کے لئے مسلمانوں کو بطور ڈھال استعمال کرتے۔ برطانیہ سے آزادی کے بعد مسلمانوں کا پہلا قتلِ عام 1962ء میں ہوا جب فوجی حکومت نے اقتدار سنبھالنے

کے بعد مسلمانوں کو باغی قرار دے کر ان کے خلاف آپریشن شروع کر دیا، جو وقفے وقفے سے 1982ء تک جاری رہا اور اس میں کم و بیش 1 لاکھ مسلمان شہید ہوئے اور اندازاً 20 لاکھ کے قریب مسلمان اس دور میں بنگلا دیش، بھارت اور پاکستان کی طرف ہجرت کر گئے۔ برما کی فوجی حکومت نے 1982ء کے سیٹزن شپ قانون کے تحت روہنگیا نسل کے 8 لاکھ افراد اور برما میں موجود دوسرے دس لاکھ چینی و بنگالی، مسلمانوں کو شہری ماننے سے انکار کر دیا اور ان مسلمانوں کو اپنے علاقوں سے باہر جانے کی اجازت دینے سے بھی انکار کر دیا۔ جس وجہ سے وہاں رکنے والوں پر عرصۂ حیات مزید تنگ ہو گیا۔ روہنگیا مسلمانوں کی مظلومیت کی ایک تاریخ 1997ء میں بھی رقم کی گئی جب 16 مارچ 1997ء کو دن دیہاڑے بے لگام بودھ راکھین صوبے کے شہر منداله کے مسلم اکثریتی علاقوں میں داخل ہو گئے اور مسلمانوں کے خون سے اپنی پیاس بجھانے لگے۔ گھروں، مسجدوں اور مذہبی کتابوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا، دکانوں کو لوٹ لیا گیا اور مسلمانوں کو ہجرت پر مجبور کر دیا گیا جس کے بعد مسلمانوں نے دوسرے شہروں میں پناہ لی۔ اس فساد کی اگلی قسط 15 مئی سے 12 جولائی 2001ء کے دوران اس وقت دیکھی گئی جب بودھوؤں نے ایک مسجد پر حملہ کر کے عبادت میں مصروف نمازیوں کو قتل کر دیا اور اس فساد کے نتیجے میں 11 مساجد شہید، 400 سے زائد گھروں کو نذرِ آتش اور کم و بیش 200 مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دنیا میں جب کبھی، کہیں بھی کسی نے اگر اسلام کے نام پر کوئی ظلم کیا تو اس کا شکار بے چارے روہنگیا مسلمان ہوئے۔ حتیٰ کہ جب طالبان کی طرف سے بامیان کے مجسّموں کو نشانہ بنایا گیا تو اس وقت بھی روہنگیا مسلمانوں پر حملے کی خبریں سامنے آتی رہیں اور بودھ بھکشوؤں کی جانب سے مسلسل یہ ہی مطالبہ کیا جاتا رہا کہ برمی حکومت کو انتقاماً برما میں موجود تمام مسجدوں کو ڈھا دینا چاہئے۔

1962ء سے میانمار فوجی حکومت کے زیر اثر تھا۔ 2010ء میں الیکشن ہوئے جس کے نتیجے میں طویل آمریت کا یہ سورج 2011ء میں غروب ہوا اور ملک میں ایک جمہوری حکومت تشکیل دی گئی۔ اس دوران روہنگیا مسلمانوں نے بھی اپنے بنیادی انسانی حقوق اور شہریت کا مطالبہ دہرایا لیکن بڑی سختی کے ساتھ یہ آواز دبا دی گئی۔ مسلم کش فسادات کی ایک قسط مئی 2012ء میں بھی نشر ہوئی جب ایک بودھ لڑکی نے اسلام قبول کر لیا جس پر بودھ بہت رنجیدہ ہوئے اور لڑکی کو گھر بدر

کر دیا، لڑکی نے مسلم آبادی میں پناہ لے لی۔ چند دن بعد اس لڑکی کی لاش ملی، جسے زیادتی کے بعد قتل کیا گیا تھا۔ مسلمانوں نے بیان دیا کہ بودھوؤں نے اپنی خفت مٹانے کے لئے اسے قتل کیا ہے جبکہ بودھوؤں نے تین مسلمان نوجوانوں کو اس قتل کا ذمہ دار قرار دے دیا۔ جس نے علاقے کے حالات کافی کشیدہ کر دیے۔ اس کے بعد 3 جون 2012ء کو بودھ بھکشوؤں نے زائرین کی ایک بس روکی اور اس میں سے عمرہ کی ادائیگی کر کے واپس آنے والے 10 مسلمان علما کو باہر نکال کر موت کے گھاٹ اتار دیا اور بس جلا دی۔ ساتھ ہی ساتھ بودھوؤں کی جانب سے مسلم اکثریتی علاقوں پر بھی دھاوا بول دیا گیا۔ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ انسانی حقوق کی تنظیموں نے بھی اس قتلِ عام پر بہت واویلا کیا مگر کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ پہلے پہل تو مقامی حکومت کی جانب سے اسے صاف جھٹلا کر حیلے بہانے کئے جاتے رہے اور متاثرہ علاقوں میں کرفیو لگا دیا اور فوج بھیج کر صحافیوں کو فسادزدہ علاقوں سے نکال دیا گیا۔ مگر اگست 2012ء میں برطانوی ٹی وی چینل چینل فور نے ایک دستاویزی رپورٹ نشر کی جس میں دکھایا گیا کہ کس طرح مسلمان، کیمپوں میں جانوروں والی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ اس کے علاوہ رپوٹ میں قریباً ایک ہزار مکانات کا ملبہ بھی دکھایا گیا۔ جس کے بعد اقوامِ متحدہ کے ادارہ برائے پناہ گزین نے اپنی رپورٹ جاری کی جس کے مطابق تشدد کی اس لہر میں کم از کم 80 ہزار مسلمان اپنا گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ اقوامِ متحدہ کی ایک اعلیٰ عہدیدار نوی پلے نے انتظامیہ کے سلوک و رویے کے حوالے سے بھی ایک رپورٹ دی کہ مقامی پولیس اور بدامنی پر قابو پانے کے لیے بھیجے جانے والی فوج بھی بے گناہ مسلمانوں کو ہی نشانہ بنا رہی ہے۔ پھر جولائی 2012ء میں برطانوی نشریاتی ادارے نے بنگلا دیش کے کیمپوں میں مقیم روہنگیا مسلمانوں پر ایک رپورٹ شائع کی جس میں اکثر نے یہ دعوی کیا کہ ان کے عزیزوں اور رشتہ داروں کو میانمار کی فوج نے قتل کیا۔ اکتوبر 2012ء میں جب مسلم ممالک کی تنظیم او آئی سی نے مسلمانوں کی مدد کے لئے میانمار میں دفتر کھولنے کی اجازت طلب کی تو میانمار کے صدر نے نہ صرف اجازت دینے سے انکار کر دیا بلکہ یہ بھی کہا کہ اس طرح کے دفاتر لوگوں کی خواہشات سے مطابقت نہیں رکھتے۔ ہیومن رائٹس واچ نے بارہا عالمی برادری کے سامنے بے شمار ٹھوس دستاویزی اور تصویری ثبوت پیش بھی کیے اور اس ضمن میں اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل بان کی مون سے بھی اپیل کی کہ وہ تشدد روکنے میں اپنا

کردار ادا کریں لیکن ساری کوششیں بے سود رہیں۔

دوسری جانب میانمار کی عالمی شہرت یافتہ رہنما آنگ سان سوچی نے مسلمانوں کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے یہاں تک کہا کہ رہنما کو مسائل کی بنیاد دیکھے بغیر کسی خاص مقصد کے لئے کھڑے نہیں ہو جانا چاہئے، انسانی حقوق کی تمام تنظیموں نے اس پر سوچی کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا اور کہا کہ انہیں اس قسم کے ردّعمل پر سخت مایوسی ہوئی ہے۔ پھر 2012ء میں عین عیدالاضحیٰ کے موقع پر جانوروں کو ذبح کرنے پر پابندی لگا دی گئی جس کے نتیجہ میں عید کے روز ہونے والے فساد میں 50 مسلمانوں نے اپنی جان کی قربانی دی اور ویسے بھی جہاں انسانوں کا گلا کاٹا جا رہا ہو وہاں سنتِ ابراہیمی کی یاد میں جانور نہ کاٹنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور فرق پڑتا ہی کسے ہے، تمام عالم ہی چپ چاپ تماشا دیکھنے میں مصروف ہے۔ میانمار کی حکومت اور اس کا موقف کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ میانمار کے صدر نے تو جولائی 2012 میں میڈیا سے بات چیت کرتے ہوئے صاف الفاظ میں کہا تھا کہ اس سارے مسئلے کا حل صرف یہی ہے کہ یا تو مسلمانوں کو ملک بدر کیا جائے یا پھر انہیں مہاجر کیمپوں میں منتقل کیا جائے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل، ہیومن رائٹس واچ اور اقوامِ متحدہ سمیت کئی عالمی اداروں نے حکومت سے غیر جانبدارانہ تحقیقات کا بارہا مطالبہ کیا ہے مگر ہمیشہ ٹال مٹول سے کام لیا جاتا رہا۔ ان عالمی اداروں کی کاوشوں سے فسادات کی تحقیقات کے لیے 2012ء میں مسلمانوں، بودھ، عالمی اور مقامی لوگوں پر مشتمل ایک کمیشن بھی تشکیل دیا گیا مگر عین وقت پر میانمار کی حکومت نے اقوامِ متحدہ کی قیادت میں کمیشن کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر ان فسادات میں ایک ٹھہراؤ سا آ گیا لیکن بعد میں یہ ثابت ہوا کہ یہ ٹھہراؤ ایک بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھا کیونکہ اس کے بعد فسادات کی لہر راکھین سے نکل کر ملک کے سب سے بڑے شہر رنگون تک پہنچ گئی۔ اس تمام عرصے کے دوران متاثرہ علاقوں میں کرفیو لگا رہا جبکہ مسلم ممالک اور انسانی حقوق کے دعویدار روز روز کی اس چک چک اور بک بک سے تنگ آ چکے تھے۔ اسی دوران 2013ء میں مسلمانوں کی نسل کشی کے لیے میانمار کے دو صوبوں میں ایک سے زیادہ بچے پیدا کرنے پر بھی پابندی عائد کر دی گئی جبکہ ان کے خلاف قتل و غارت گری کا بازار گرم کرنے کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ بودھوؤں سے تو کسی کو کوئی گلہ بھی نہیں تھا کیونکہ وہ درست انداز میں گوتم بودھ کے فلسفے پر عمل کر رہے ہیں کہ آپ کا فلسفہ تھا کہ جس نے کسی جانور کو بھی قتل کیا تو وہ ایسے ہی

ہے جیسے اس نے کسی انسان کو قتل کیا۔ بس ذرا سا سمجھنے کا فرق ہے کہ میانمار کے بودھ بھکشوؤں نے یہ سمجھ لیا کہ جس نے کسی انسان کو قتل کیا تو وہ ایسے ہی ہے جیسے اس نے کسی جانور کو قتل کیا۔ البتہ مسئلہ تو روہنگیا مسلمانوں کا تھا کہ وہ کہاں جاتے، کس کو دکھڑے سناتے۔ شرع یہ کہتی ہے کہ جب تم پر زمین تنگ کردی جائے تو ہجرت کر جاؤ، روہنگیائی ہجرت کر کے بنگلا دیش پہنچے جہاں پر ان کا گولیوں کے ساتھ استقبال کیا گیا، کئی مر گئے، کچھ زخمی ہوئے مگر مجال کہ کسی نے دنیا کے اس سوتیلے بچے کو جسے اس کا ملک بھی تسلیم نہیں کرتا، اپنانے میں حامی بھری ہو۔ انڈونیشیا، ملائشیا، تھائی لینڈ، سنگاپور، سری لنکا کون سا ایسا ملک تھا جہاں انہوں نے رحم طلب نگاہوں سے پناہ کی اپیل نہ کی ہو۔ وہ بھارت گئے مگر وہاں بھی ردّعمل مختلف نہ تھا۔ یہ تو فطرتِ انسانی ہے کہ وہ مہمان کو بھی چند دن سے زیادہ قبول نہیں کرتی۔ اسی لئے بنگلا دیشی حکومت نے اپنا اصل رخ دکھلایا اور جو پناہ گزین بنگلا دیش میں محصور تھے انہیں فوری طور پر بنگلا دیش سے نکل جانے کو کہا۔ یہ ساڑھے تین ہزار افراد خدا کے سہارے کشتیوں میں بیٹھ کر نکل پڑے کہ شاید کوئی ان پر مہربان ہو جائے مگر یہ تو دنیا کے لئے ایک پنگ پانگ بال کی حیثیت رکھتے تھے، بنگلا دیش نے بال کو ہٹ کیا تو یہ سری لنکا پہنچا، وہاں سے ہٹ ہوئے تو تھائی لینڈ، وہاں سے ملائیشیا، وہاں سے انڈونیشیا، وہاں سے سنگاپور۔ دنیا کو کیا فکر کہ یہ انسانوں کی بات ہو رہی ہے، ان کے بھی کچھ حقوق ہیں، سب کو اپنا بارڈر محفوظ اور پناہ گزین سے پاک چاہئے تھا۔ مسلمان حکمرانوں میں سے صرف ترکی کے طیب اردگان ان مظلوموں کے آنسو پونچھنے کے لئے سرگرم عمل ہیں باقی مسلم ممالک کی قیادت ابھی تک زبانی جمع خرچ کرنے تک محدود نظر آ رہی ہے۔ آخری اطلاعات تک اپنے گھروں سے جبری طور پر نکالے گئے تین لاکھ روہنگیا مسلمان بنگلہ دیش جا پہنچے ہیں۔ تاہم اب یہ مسئلہ او آئی سی اور اقوام متحدہ تک جا پہنچا ہے دیکھتے ہیں ان مظلوم لاکھوں افراد کی آہوں اور سسکیوں اور بڑے ہی ظالمانہ طریقے سے ناحق بہائے گئے خون کا کیا نتیجہ نکلتا ہے؟

اک کرن بھی تو نہیں غم کی اندھیری رات میں
کوئی جگنو، کوئی آنسو، کوئی تارا، کچھ تو ہو

اقبال

تبصرہ وتعارف کتب

1 تحریک وتعمیر پاکستان کے

جاوِداں چہرے

پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

ناشر: مقبول اکیڈمی، سرکلر روڈ، اردو بازار، لاہور

تبصرہ نگار: حافظ مختار احمد گوندل

زیر تبصرہ تصنیف کا آغاز برعظیم پاک و ہند میں اسلام کی آمد اور اختتام آفتابِ خدمت بن کر نمودار ہونے والی معروف شخصیت 'عبدالستار ایدھی' مرحوم پر ہوتا ہے۔ عنوان سے ظاہر ہے کہ آزادیٔ ہند اور قیامِ پاکستان کے منظر و پس منظر کے حوالہ سے یہ تحریر امتیازی اوصاف کی حامل ہے۔ اس میں زعمائے تحریک پاکستان کے ساتھ ساتھ سرگودھا کے معروف خاندانوں کی سیاسی خدمات کا تفصیلی تذکرہ ان کے اَمر ہوجانے کا زندہ ثبوت ہے۔ سرگودھا کے ان معروف خاندانوں میں خزینہ بصیرت و معرفت منبع طریقت و ولایت اور مینارہ نور و ہدایت خانوادہ سیال شریف کے شمس العارفین حضرت خواجہ شمس الدین سیالویؒ جو دبستانِ شاہ محمد سلیمان تونسویؒ کی صحبتوں سے فیض یافتہ تھے اور ان کے خلفاء برعظیم پاک و ہند میں انقلاب برپا کرنے والی وہ تحریکی شخصیات جنھیں علامہ اقبال کی زبان میں ''قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآں'' کہا گیا، کے ابواب خصوصی طور پر قابل مطالعہ ہیں۔ صاحب تصنیف نے محققانہ انداز تحریر کے حامل کے ہونے سبب کتاب کو ادبی و تحقیقی حوالوں سے بھی مزین کیا ہے۔ دیگر اضلاع میں بھی آزادی کے متوالوں پر ایسی تحقیقات ہونی چاہئیں۔ خطہ جھنگ کے حوالہ سے ڈاکٹریٹ کی سطح پر اسی طرح کے مقالہ میں تبصرہ نگار کی معاونت جاری ہے۔ اگر کتاب کا نرخ ارزاں ہوتا تو عام قاری بھی اس کے مطالعہ سے مستفید ہوسکتا۔ تاہم کتب خانوں کے ذخائر میں ایک نادر اضافہ ہے۔

2 خطباتِ دائم

جلداوّل: مختلف موضوعات۔ جلددوم بسلسلۂ نماز

حضرت علامہ قاضی عبدالدائم دائم

ناشر: خانقاہ نقشبندیہ مجددیہ، ہری پور ہزارہ

تبصرہ نگار: حافظ مختار احمد گوندل

خطباتِ دائم کی جلداوّل میں ایمان اَفروز مختلف موضوعات پر اٹھارہ خطبات ہیں جن میں ذکر الٰہی، عظمت قرآن، وسیلہ جلیلہ، شانِ عبدیت، نعتِ مصطفےٰ ﷺ، شانِ صدیق اکبر، شانِ فاروق اعظم، شانِ عثمان غنی، شانِ علی رضی اللہ عنہم، شانِ اولیاء، مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ، زکوٰۃ وانفاق فی سبیل اللہ، تعمیر مسجد، جمعۃ الوداع، توبہ واستغفار اور کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ شامل ہیں۔ جبکہ جلددوم میں 21 خطبات ہیں جن کا آغاز طہارت ووضو کے فضائل ومسائل سے ہوتا ہے اور اختتام درودِ ابراہیمی، نماز کی آخری دعا اور نماز کے بعد ذکر بالجہر یا خفی کے موضوع پر ہوتا ہے۔ یعنی ان تمام اُمور جو نماز سے متعلق ہیں، کی تفصیلات ہیں۔ نماز سے متعلقہ ان خطبات کے مطالعہ کے بعد یقیناً قاری کی وہ کیفیت نہیں رہتی جسے شاعر مشرق نے یوں بیان کیا ہے

میں جو سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
تیرا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں

یہ خطبات قارئین کی معلومات میں اضافہ کا ذریعہ اور کتب خانوں کی ناگزیر ضرورت ہیں۔

3 شخصیت وخدمات

زاہدِ پاکستان

مصنف: پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

ناشر: مقبول اکیڈمی، اردو بازار لاہور

زیر تبصرہ کتاب میں ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم صاحب نے عالمی شہرت یافتہ صحافی، دانش ور، چیئرمین نظریۂ پاکستان کونسل جناب زاہد ملک کی شخصیت اور خدمات پر اور ان کی ذاتی اور ان کے زیر نگرانی

شائع ہونے والی کتب پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ زاہد ملک کے انتقال پر موصولہ تعزیت ناموں کے علاوہ ڈاکٹر ایوب صابر، ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم، گوہر ملک، ڈاکٹر نعیم غنی، مہتاب خان، عابد کمالوی، جنرل مرزا اسلم بیگ، سیّد نذیر احمد بخاری، ممتاز عارف، کنور محمد دلشاد، واحد سراج، شہباز انور خان، سعید یہ راشد، افتخار مجاز، عقید الرحمٰن، آصف ثاقب، ڈاکٹر غضنفر مہدی، ڈاکٹر مقصود جعفری، ڈاکٹر زاہد حسن چغتائی، عبدالقادر حسن، آصف بھلی، غلام اکبر، عطاء الحق قاسمی، خالد رحمٰن، جاوید حفیظ، جبار مرزا، انجم خلیق کے اردو مضامین کے علاوہ انگریزی مضامین کتاب کی زینت ہیں۔ ان مضامین میں مرحوم زاہد ملک کی شخصیت اور لازوال خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سوانح نگاری، فن اور شخصیت کے بارے میں یہ کتاب اہمیت کی حامل ہے۔

4 افادات وملفوظاتِ عزیزیہ

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دعا جو قدس اللہ سرہ

تالیف: عتیق الرحمٰن

ناشر: القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ خالق آباد ضلع نوشہرہ وخیبر پختونخواہ

تبصرہ نگار: حافظ مختار احمد گوندل

زیر تبصرہ ملفوظاتِ عزیزیہ ایک صاحب نسبت وطریقت، شناسائے معرفت کے وہ فرمودات و ارشادات ہیں جن میں اصلاح وانقلاب کا جذبہ اور رضائے الٰہی کے حصول کا ولولہ پنہاں ہے۔ ان کے ملفوظات خوبصورت استعارات، تشبیہات اور الفاظ کے سانچوں میں ڈھلے ان کے وہ خیالات، محسوسات اور مشاہدات ہیں جن سے قاری کا ذہن سحر انگیز تأثرات میں ڈوب ڈوب جاتا ہے اور یہ ہماری وہ تہذیبی روایت بھی ہے جو اہل تصوف کے ہاں ابھی تک مروّج ہے۔ روحانی وعلمی ورثہ ہونے کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں ملفوظات کے حوالہ سے یہ ایک گراں قدر اضافہ بھی ہے۔ مرتب نے اس کی ضبط وترتیب کا کام بڑی سلیقہ مندی سے انجام دیا ہے۔ ان کے شوق وجستجو نے رہ نوردانِ ادب وتصوف کو روحانی تسکین کا سامان بھی فراہم کیا ہے اور سلوک وطریقت کے فکر وفن کی راہوں کو بھی وا کر دیا ہے۔ تعلیم وتربیت نفس اور روحانی تزکیہ کے حوالے سے ان کے اشعار نہایت اکسیر ہیں۔ جیسا کہ کتاب میں ان کا اختتامی شعر یہ ہے

کیوں نہ پھر جاؤں میں سب سے مصطفیٰؐ کے سامنے
کون ہو محبوب محبوبِ خدا کے سامنے

15 روزہ

دورہ تربیت المُبلّغین

مقام: دارالمبلّغین، مرکزی دفتر مجلس احرار اسلام پاکستان، 69/C حسین سٹریٹ وحدت روڈ نیو مسلم ٹاؤن لاہور

22/اکتوبر تا 5/نومبر 2017 فضلاء درسِ نظامی کے لیے شاندار موقع

زیر سرپرستی: ابن امیر شریعت حضرت پیر جی

سیّد عطاء المہیمن بخاری دامت برکاتہ امیر مجلس احرارِ اسلام پاکستان

زیر نگرانی: مجاہد ختم نبوت عبداللطیف خالد چیمہ

سیّد محمد کفیل بخاری

میاں محمد اویس

شرائط داخلہ

(۱) سکول و کالجز کے طلباء کے لیے تعلیم کم از کم میٹرک

(۲) مدارس کے طلباء کے لیے درسِ نظامی یا حفظ قرآن مع لکھنا پڑھنا جانتا ہو

(۳) اصل قومی شناختی کارڈ اور اس کی فوٹو کاپی ہمراہ لائیں

قیام وطعام اور معقول وظیفہ بذمہ ادارہ روزانہ بعد نماز مغرب اصلاحی مجلس

جید علماء کرام، مذہبی سکالرز اور سابق قادیانی ماہرین کی ٹیم جدید ترین

سمعی بصری ذرائع ابلاغ کے ساتھ داعیان کی تیاری کروائیں گے

برائے رابطہ ڈاکٹر محمد آصف: 0300-9522878

منجانب: شعبہ تبلیغ تحفظ ختم نبوت، مجلس احرارِ اسلام پاکستان

ان شاءاللہ العزیز

قرآن اکیڈمی جھنگ

25 روزہ قرآن فہمی کورس

پھر سوئے حرم لے چل

40واں کورس

30 اکتوبر تا 22 نومبر 2017ء

جس میں ترجیحاً انٹرمیڈیٹ تعلیم کے حامل طلباء، کاروباری و ملازمت پیشہ اور بے روزگار حضرات شریک ہو سکتے ہیں تاکہ قران مجید کے ساتھ ساتھ دیگر دینی علوم سیکھ کر عملی زندگی میں باعمل مسلمان کی زندگی بسر کر سکیں۔

معلومات کے لیے 20 روپے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر اس تربیتی کورس کا بروشر مفت حاصل کریں یا hikmatbaalhga@yahoo.com پر بروشر کے حصول کے لیے درخواست ای میل کریں

اپنی فرصت کے مطابق بذریعہ فون یا ای میل اپنا نام رجسٹر کرائیں

قرآن اکیڈمی جھنگ

لالہ زار کالونی نمبر 2، ٹوبہ روڈ جھنگ صدر

0336-6778561

فرمودۂ اقبال

پیامِ فاروق رضی اللہ عنہ

تو اے بادِ بیاباں از عرب خیز
ز نیل مصریاں موجے برانگیز
بگو فاروقؔ را پیغامِ فاروقؓ
کہ خود در فقر و سلطانی بیامیز!
خلافت، فقر با تاج و سریر است
زہے دولت کہ پایاں ناپذیر است
جواں بختا! مدہ از دست ایں فقر
کہ بے او پادشاہی زُود میر است!

ترجمہ: اے صحرا کی ہوا! تو عرب سے اُٹھ اور مصر کے دریائے نیل سے کوئی لہر اٹھا۔ اور فاروق (مصر کے بادشاہ) کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ پیغام سنا کہ اپنے اندر فقیری اور بادشاہی کو (ایک ساتھ) جمع کرے۔ خلافت، بادشاہی کے ساتھ فقیری کا نام ہے۔ یہ (فقر) کتنی اچھی دولت ہے کہ کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اے خوش نصیب! اس فقر کو ہاتھ سے جانے مت دے کیونکہ اس کے بغیر بادشاہی جلد ختم ہو جاتی ہے۔

نومبر 2017ء

اِنْ شَآءَ اللّٰہ

ماہنامہ حکمت بالغہ جھنگ

2017ء

کی خصوصی اشاعت

بادشاہ، پرنس اور ارب پتی
یا
درویش حکمران

شیخ قبیلہ، نمبردار، تمن دار، منصب دار، بادشاہ، ولی عہد اور شہزادے اجتماعیت کی تاریخ کے نمایاں عنوان ہیں۔ تاہم تاریخ نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ سب سے زیادہ انسان دوست، علم دوست اور اخلاق دوست حکمران درویش حکمران ہی ثابت ہوئے۔

کے عنوان سے خصوصی اشاعت کا اہتمام کر رہا ہے

اہل قلم، اہل علم اور ملت اسلامیہ کے بہی خواہوں
سے قلمی تعاون اور دعاؤں کی درخواست ہے

انجینئر مختار فاروقی مدیر حکمت بالغہ جھنگ